9

قرۃ العین حیدر

میری لائبریری

میرے بھی صنم خانے

تازہ تازہ ہرا بھرا خوشبودار ناول

چوتھا ایڈیشن

میری لائبریری میں

قرۃ العین حیدر

میرے بھی صنم خانے

۱۔ تراشیدم

۲۔ پرستیدم

۳۔ شکستم

مکتبہ میری لائبریری لاہور

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء

بار دوم ۱۹۶۲ء بار سوم ۱۹۶۵ء

طابع:- پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ناشر:- بشیر احمد چودھری
ڈائریکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

بار چہارم ۱۹۶ ء

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱)

چلی جاتے موری نیّا کنارے کنارے

اس وقت بل کھاتے طویل پہاڑی راستے کے کنارے کنارے بکھری ہوئی سرخ چٹانوں کے پیچھے بہار کا نارنجی آفتاب مدھم ہو کر چھپتا جا رہا تھا۔ شام کی ہواؤں میں ابھی خنکی باقی تھی۔ لیکن ان میں خود رو کوہستانی پھولوں کی تیز مہک تیرنی شروع ہو گئی تھی اور شفاف، ٹھنڈے پانی کے چشموں پر جہاں انجیر کی ڈالیاں جھکی ہوئی تھیں شام کا اندھیرا گرتا آ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں پٹردل کی انگریزی ایجنسی کی عمارتوں کے سامنے سڑک کی دوسری طرف انجیر کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں چھپا ہوا وہ چھوٹا سا ہوٹل برقی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔

وہ اپنا دن بھر کا کام ختم کر کے تھکا ہارا اس ہوٹل کے زینے کی سرخ قالینوں والی گیلری میں پہنچا اور وہاں سے اپنے کمروں کی طرف جانے کے بجائے بے انتہا اکتاہٹ کے ساتھ ٹی روم میں چلا گیا اور اس کے دریچے میں سے چپ چاپ باہر درختوں کے پرے دیکھنے لگا۔ جہاں لہراتی ہوئی سفید سڑک پہاڑیوں کو کاٹتی چکر کھاتی اُن اودی

ان ہرے نخلستانوں کی سمت نکل گئی تھی۔ جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے قصبے تھے اور پھلوں کے سایہ دار درختوں کے جھنڈ تھے اور ٹھنڈے پانی کی جھیلیں تھیں۔ جہاں سیاہ آنکھوں والی سفید فام ارمنی لڑکیاں سائے کی طرح گلیوں میں سے گزر کے ایک گھر کے دروازے میں سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہو جاتی تھیں اور سرخ بالوں والے بچے جھیلوں کے کنارے رنگین سنگریزوں سے کھیلتے تھے اور اس ابدی سکون اس لامتناہی خاموشی کے خواب آگیں سحر کو ایک جھٹکے سے توڑتی ہوئی بھاری بھاری لاریاں اس راستے پر سے نکل جاتی تھیں اور اس کے بعد پھر وہی سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ رات کی بے چین تاریکی میں یہ سناٹا زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ زیادہ گمبھیرتا سے گونجتا تھا۔ یہاں تک کہ ہوٹل کی نچلی منزل میں مغرب کی سفید فام قوموں کی اس انتہائی مختصر سی نو آبادی کے چھوٹے موٹے مقامی ڈانس بینڈ کے سارے ساز چلا اٹھتے تھے اور صبح کی اولیں ساعتوں تک چیختے رہنے کے بعد تھک کر خاموش ہو جاتے تھے اور ہوٹل کی رقص گاہ اور ریڈ کراس ایجنسی کے سوئمنگ پول اور ہسپتال کے لکڑی کے بنگلے کی ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ جاتی تھیں۔

وہ دریچے میں کھڑے کھڑے اور بھی زیادہ اکتا گیا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا اور بے دلی سے ایک فارسی رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ابھی تو چائے پینی ہے۔ ٹی روم کے سرے پر اس کے مخصوص دریچے کے نزدیک ایک چھوٹی سی سنگ مرمر کی میز پر اس کی ڈاک اور اس کا سماوار اس کے منتظر تھے۔ آتشدان میں آگ کب کی بجھ چکی تھی کیونکہ موسم تبدیل ہوتا جا رہا تھا اور وادیوں میں بہار کی آمد آمد تھی۔ دریچے کے باہر انگور

کی بیل کے پتے شام کی ہواؤں میں آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ نیچے ہوٹل کے صحن کے وسط میں سرخ پتھروں کے فوارے پر ایک تاریخی تلبنے کا فرشتہ اپنا پرانا بربط لئے ایک ستون پہ چڑھا بیٹھا تھا اور اس میں سے کبھی کبھی پانی کی سرد پھواریں اُبل پڑتی تھیں۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے قطرے انجیر کے پتوں میں سے چھنتی ہوئی پورچ کی مدھم روشنی میں ایک لمحہ کے لئے جگمگا اٹھتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک کی ڈھلوان پر سے بھاری اور مسلح روسی موٹریں شور مچاتی گزر جاتی تھیں اور موڑ پر پہنچ کر وادی کے پرے جاتے ہوئے ان کی آوازیں رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی جاتی تھیں۔

صبح کی ہوائی ڈاک بے خیالی سے اُلٹنے پلٹنے کے بعد صوفے پر بیٹھ کر ہاتھوں میں چہرہ رکھے وہ لاؤنج کے سرخ پردوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹی روم کے ستونوں کے پرے سرخ قالینوں والے ہال کے سرے پر بار کے پیچھے سے چقندر ایسی ناک والے موسیو وڈسلے کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ہال کے دبیز گدیلوں والے صوفوں پر کچھ لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ چند سنجیدہ اور متفکر چہروں اور سرخ مونچھوں والے روسی اپنے سامنے رکھے ہوئے شراب کے گلاسوں میں سوڈے کے اٹھتے ہوئے بلبلوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بار کے سامنے پٹرول کمپنی کا انگریز منیجر گھومنے والے اونچے اسٹول پر بیٹھا غمِ دل اور غمِ روزگار کو بیئر کے بڑے مگ میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کچھ دیر بعد ہوٹل کی چھت پر سے کوئی جنگی طیارہ زور زور سے گڑگڑاتا فضا کی بیکراں تاریکی میں اپنی منزل کی سمت گزر جاتا تھا۔

وہاں پر اس وقت ایسا ناقابلِ برداشت، منجمد اور مطمئن سکوت دھیرے دھیرے گرج رہا تھا جو اکثر کسی بڑی آندھی کی آمد کا پیغامبر ہوتا ہے۔

وہ اکیلا اپنے صوفے پر بیٹھا چائے کی پیالی میں چمچہ بجاتا اور ایک طبی رسالہ پڑھتا رہا
رات کے کھانے کی گھنٹی میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔

تھوڑی دیر بعد لاؤنج کے سرخ پردوں کو جنبش ہوئی اور ہنستی شور مچاتی چند امریکن
لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں اور وہاں پر زندگی کے سارے آثار یکلخت پیدا ہو گئے۔ شراب
کے گلاس ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ دبے دبے قہقہے گونج اٹھے اور ریڈیو پر دنیا
کے سارے اسٹیشنوں کو ٹیون کیا جانے لگا۔ پیانو پر دور افتادہ ہالی وڈ کی تازہ ترین
دھنیں چھیڑ دی گئیں اور بوڑھا موسیو، انگریز منیجر اور روسی افسر سب مل کر ایک ساتھ
باتیں کرنے لگے۔

ٹی روم میں وہ اسی طرح بیٹھا طبی رسالہ پڑھتا رہا
"وہ کہاں ہے" ایک عنابی بالوں والی لڑکی نے اپنی شربتی آنکھیں چاروں طرف
گھما کر ایک صوفے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"کون" انگریز منیجر نے ایک پھول اٹھا کر بے تعلقی سے دریافت کیا۔
"وہی۔ سانولا، سیاہ آنکھوں والا مغرور ہندوستانی" دوسری لڑکی نے گراموفون
کے لئے ریکارڈ منتخب کرتے ہوئے میز پر چڑھ کر کہا۔

مردوں نے لاؤنج کے سرخ پردوں کی طرف ذرا ناپسندیدگی کا اظہار کرتی
ہوئی سرسری نظر ڈالی اور پھر کوک ٹیل بنانے میں مصروف ہو گئے۔
نچلی منزل میں رات کے کھانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔
رفتہ رفتہ بہت سے امریکن، روسی، انگریز اور ہندوستانی سوئمنگ پول کے کلب
اور اپنے اپنے کمروں میں سے نکل آئے اور سب نیچے چلے گئے۔

چھندر ایسی ناک والا موسیو دُودے بار کے پیچھے بیٹھا اونگھتا رہا۔ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ وہ بار کے کام سے چھٹی پا جاتا تو اپنے اونچے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا گیلری میں سے گذرنے یا ہال میں آنے جانے والوں کو اپنی نیم باز خوابیدہ آنکھوں سے فیموں کی طرح دیکھتا رہتا اور شاید فلسفۂ حیات پر غور کیا کرتا۔

طبّی رسالہ ایک طرف پھینک کر اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا اور ایک لمبا سا گہرا سانس لے کر سوچا۔ چنانچہ ایک اور غیر دلچسپ طویل، بے رنگ دن کا اختتام ہوا۔ اُس نے ایک طویل انگڑائی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ جس کی وجہ سے اس کی لمبی کالی پلکیں نیچے جھک آئیں۔

امریکن لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ اسے شور مچانے والی بے تکلف بشاش امریکن لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔ اسے خیال آیا جب تک وہ طہران میں رہا۔ اُس کا وقت کتنی دلچسپی سے گذرتا تھا برطانوی سفارت خانے کے بال اور شاہِ ایران کے محل کی ضیافتیں۔ وہ ایرانی امراء کی گوری گوری، دبیز اور گداز لڑکیاں جو کس قدر صفائی سے اس سے عشق کرتی تھیں کہ وہ ——— اور اس کے دوست پلکیں جھپکتے رہ جاتے تھے اور کیسپین کے ساحل اور شمران کی پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی اسے لندن اور پیرس اور وی آنا کے مقابلے میں طہران کہیں زیادہ اچھا لگتا تھا۔

لیکن فی الحال تو وہ کھانے کی گھنٹی کے انتظار میں مصروف تھا اور نچلی منزل میں امریکن لڑکیاں متواتر ہنسے جا رہی تھیں۔

اور تب یکایک ہوائی جہاز کے انجن کے شور کے ساتھ ساتھ ٹیرس کے نیچے بہت سی موٹروں کی ایک دھکے کے ساتھ رکنے کی آواز آئی۔ چاروں طرف چیخ پکار مچ گئی

اور نچلی منزل سے بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے سڑک کی طرف چلے گئے۔
"کیا بات ہے موسیو"۔ اس نے صوفے پر لیٹے لیٹے سگریٹ کے ڈبے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"غالباً ایک اور حادثہ"۔ موسیو دوبے نے اپنی آنکھیں آدھی کھول کر جواب دیا اور پھر اپنی سوتی سوتی آواز میں بولا۔ "موسیو کو اب تک پیاس نہیں معلوم ہوئی؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر کوک ٹیل بنانے میں مصروف ہو گیا۔
• باہر اسی طرح شور مچ رہا تھا۔ موسیو ڈوبے کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ جنگ ختم ہونے والی تھی۔ لیکن فوجوں کے کونوائے دن رات اس پہاڑی راستے پر سے گذرتے رہتے تھے اور ایک نہ ایک حادثہ پیش آجاتا تھا۔ مختلف کیمپوں کو جانے والے دستے وہاں پڑاؤ کر رکتے — پٹرول لیا جاتا۔ افسر ہوٹل کے بار پر تازہ دم ہوتے۔ زخمی لکڑی کے جنگلے والے ہسپتال تک پہنچائے جاتے مہینوں سے یہ چکر یونہی چل رہا تھا۔
اس نے سگریٹ دریچے سے باہر پھینک دیا اور پھر ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر اپنی سیاہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ اسے معلوم تھا۔ ابھی اس کا اردلی آکر اس سے کہے گا۔ بڑے صاحب چلیے ہسپتال۔ ایک اور حادثہ۔ یا ایک اور آپریشن۔ کسی کی ناک ٹوٹی ہوگی کسی کے کان۔ کوئی یونہی تفریحاً ہسپتال میں داخل ہونا چاہتا ہوگا۔ کہ جب تک یہاں قیام رہے بےفکری اور آرام سے وقت گذرے۔ اس نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی اب وہ کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں جا کر سو جانا چاہتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا سارے ملازم اپنے اپنے کام چھوڑ کر باہر پہنچ گئے تھے۔

پھر وہ شور، وہ گہما گہمی نزدیک تر آگئی۔ مدھم ستاروں کے نیچے بہت سے سائے بجلے ٹیرس پر سے گذرتے ہوئے ڈرائیو پر آ گئے۔ دو اسٹیشن ویگن پٹرول پمپ کے پاس لے جا کر کھڑے کر دیئے گئے۔

اور وہ سب دفعتہً تاریکی میں سے نکل کر پورچ کی روشنی میں آ گئے۔

لاؤنج کے دریچے میں سے اس نے دیکھا۔ وہ کئی تھے۔ بھاری بھاری غرارے پہنے شالوں میں لپٹی ہوئی بیگمات کئی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے۔ بہت سے ملازمین۔ دو تین کتے۔ ہوٹل کا منیجر بھاگا بھاگا ان کے خیر مقدم کے لئے پہنچا اور کچھ فورسٹ لینڈنگ اور رات بھر کے قیام کے متعلق باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟" موسیو ودے نے اپنے اسٹول پر سے اچک کر ایک ملازم سے پوچھا جو نہایت سرعت سے گیلری میں سے گذر رہا تھا۔

"اب تک تو نہیں۔ صرف ایک موٹر کا اگلا مڈگارڈ ٹوٹ گیا ہے۔" اس نے جواب دیا اور زینے کے دروازے میں غائب ہو گیا۔

پھر وہ سب اوپر آ گئے۔ ان کا سامان گیلری میں پھیلا دیا گیا۔ ایک سیاہ، سیدھے بالوں والی لڑکی گہرے سبز رنگ کے کوڈرائے کے سلیکس پہنے اور شانوں پر اوورکوٹ ڈالے پرس جھلاتی اس سفکری سے ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ گویا ہوائی جہاز اور موٹروں کے حادثے روزمرہ کی معمولی تفریح تھی۔ اس کا رنگ زیادہ صاف نہیں تھا لیکن الزبتھ آرڈن کے بیچل شیڈ نے اسے اتنا گورا کر رکھا تھا کہ سرخ قالینوں والے ہال کی تیز روشنی میں وہ بالکل سفید نظر آ رہی تھی اور اپنے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں کی وجہ سے اپنے مغربی لباس میں ہسپانوی یا ارمنی معلوم ہوتی تھی۔

وہ اور ان کے کتے ادھر ادھر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل کے ملازمین جس سرگرمی سے بھاگ دوڑ مچا رہے تھے ــــــــــــ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نووارد دول کی شان و شوکت سے بیحد مرعوب ہو گئے ہیں۔

"دوسرا گلاس موسیو؟" ایک جمائی روکنے کے بعد موسیو دولے نے اس کے پاس آکر پوچھا۔

"نہیں بشکریہ۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟"

"پتہ نہیں۔ یہ لوگ موسیو کسی ہندوستانی رجواڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی تعزیتی سفر یا شاید مقدس زیارات سے واپس آ رہے ہیں۔" موسیو دولے نے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے صوفے پر جھک کر بڑی رازداری اور اہمیت کے لہجے میں سرگوشی کی، "دوسرا گلاس؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں بشکریہ۔" اس نے دوبارہ جواب دیا۔ موسیو دولے اسی طرح ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا بار کی طرف واپس چلا گیا۔

بھئی واہ۔ بڑے ولایتی زائرین ہیں جو کتوں کو لے کر زیارات کے لئے جاتے ہیں اُس نے ایک کتے کو لاؤنج میں چہل قدمی کرتے دیکھ کر سوچا۔

وہ سب کھانے سے پہلے اپنے کمرے دیکھنے کے لئے گیلری میں چلے گئے۔ کاؤنٹر پر جھکا ہوا موسیو دولے بیحد اشتیاق سے سبز سلیکس والی لڑکی سے فورسٹ لینڈنگ کی تفصیلات پوچھنے میں مصروف تھا۔

وہ نہایت صبر و استقلال سے ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے کھانے کی گھنٹی کا انتظار کرتا رہا۔

اور پھر بلیلنٹ ٹی روم اور ہال کی روشنیاں بجھ گئیں۔ چاروں طرف کے مدھم سے شور میں اضافہ ہو گیا۔ ملازم دوڑ بھاگ کر شمعیں روشن کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سرخ قالینوں والا ہال اندھیرا اور خالی پڑا تھا۔ بہار کا چاند جو سرخ پہاڑیوں کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔ لاؤنج کے دریچوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ موسیو دولے نے جلدی سے ہال میں آ کر پیانو پر رکھا ہوا شمعدان روشن کیا اور اس کی مدھم روشنی ٹی روم میں پھیل گئی۔ وہ جواب تک موسیو دولے سے باتیں کر رہی تھی، شمعدان اٹھا کر گیلری میں جانے لگی۔

اور اس وقت اس نے ہال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے شمعدان اونچا کر کے دیکھا اس کے سامنے لاؤنج کے سرخ پردوں کے پرے وہ صوفے پر بیٹھا ہاتھوں پر اپنا چہرہ ٹکائے اکتاہٹ کے ساتھ اپنی بڑی بڑی کالی پلکیں جھپکا رہا تھا۔

اپنے سامنے ہال کی سرخ قالینوں والی سیڑھیوں پر اس لڑکی کو شمعدان [illegible] ایک لمحے کے لئے اسے بڑے غور سے دیکھتا پایا کر وہ فوراً تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے نیچے چلیں۔ نچلی منزل کی بجلی ابھی فیل نہیں ہوئی ہے" [illegible] لڑکی نے بڑے اخلاق سے کہا اور بڑے اطمینان سے شمعدان اٹھائے [illegible] آگے آگے [illegible] گیلری میں آ گئی۔

سنسان اور اندھیری گیلری میں سے سایوں کی طرح چپ چاپ [illegible] گذرتے ہوئے وہ زینے تک آئے۔ نچلی منزل میں کھانا شروع ہو چکا تھا اور [illegible] کانٹوں کی آواز میں ملی جلی ہنسی کا شور لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"اُفوہ آپ کے ہوٹل میں کھانا کتنی دیر ہوتا ہے" [illegible] لڑکی نے شمعدان [illegible] اونچا کرتے [illegible]

پر سے اترتے ہوئے کہا۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہو کر اس نے شمعدان ایک کونے میں رکھ دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلی گئی۔

وہ خاموشی سے حسب معمول اپنی مخصوص میز پر اکیلا جا بیٹھا۔

پھر ڈنر ختم ہوا۔ اور سب کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ ایک امریکن لڑکی کوئی پرانا گیت گنگناتی اس کے پاس آئی۔

"ڈوک چلو ناچلیں۔ آج تو چھٹی کی رات ہے"۔ امریکن لڑکی نے اس سے کہا۔

سب باہر ٹیرس پر اتر آئے۔ درختوں میں قمقمے جگمگا اٹھے تھے اور چاند کی دھیمی روشنی میں پورٹیکو کے ستونوں کے سائے بڑے پراسرار معلوم ہوتے تھے۔ بالکونی میں ناچ کے سازوں نے جاز کی ایک دھن چھیڑ دی۔ شراب کے گلاس اونچے کئے گئے۔ برطانیہ کے لئے۔ روس کے لئے۔ امریکہ کے لئے۔ شیشے ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ ناچ شروع ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جاز کو کانوں کے بجائے ٹانگوں کے ذریعے سنا جاتا ہے۔ وہ بھی تھوڑی دیر تک اپنی امریکن ہم رقص کے ساتھ ناچتا رہا۔ ناچتے ہوئے وہ کئی بار ٹیرس کے ایک کونے پر جھکے ہوئے انار کے ایک پیڑ کے نیچے سے گذرے اور وہاں سے اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں کے نیچے وہ لڑکی سیاہ زرتار شام کے لباس میں گھاس پر دوزانو جھکی اپنے ایک کتے کو بیحد سنجیدگی سے کچھ سمجھا رہی ہے۔

جب وہ دوبارہ اس کے قریب سے گذرا تو ہوا کے جھونکے سے درخت کی شاخوں میں لٹکی ہوئی جاپانی قندیلیں زور زور سے جھولنے لگیں اور ان کی رنگ برنگی لرزاں جھلملاہٹ میں اس نے سر اٹھا کر اسے ایک نظر دیکھا اور اس کی سیاہ آنکھیں کہہ اٹھیں۔ ارے یہ تو

تم ہو۔ تمہیں تو میں پہچانتا ہوں
دوسرا ناچ شروع ہوا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اسے اپنی طرف مخاطب ہوتا دیکھ کر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ ٹیرس پر آ کر ناچ میں شامل ہو گئی۔

پھر نغمے کی گت تبدیل ہوئی۔ ایک بہت پرانا بہت محبوب نغمہ جو ان گنت مرتبہ ایسی ہی پراسرار راتوں میں بجایا گنگنایا گیا ہو گا۔ بہت مدھم سروں میں بجنے لگا۔

اس سیاہ آنکھوں والی خوبصورت اور مغرور جلبی کے ساتھ ساتھ ناچ کے قدم رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ واہ بھئی۔ ریگستانوں اور پہاڑیوں کے اتنے طویل اور پریشان کن سفر کے بعد اس خوشگوار رات کی خنکی کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے اور اس ہوٹل کا کھانا اور چائے بھی بہت عمدہ ہے۔

"روشنی بیٹیا اب سونے کے لئے چلنا چاہئے۔ کل ہمیں صبح سویرے ہی جگنا پڑیگا"
ناچ کے اختتام پر کسی نے اس سے کہا۔ وہ ایک ہلکا پھلکا شب بخیر کہہ کر اس کے بازو سے الگ ہو گئی اور اپنے ساتھیوں سے جا ملی اور ان کے ساتھ زینے کی سمت چلی گئی

وہ پرانا نغمہ بجا کیا۔ امریکن لڑکی کے انتظار میں وہ ایک آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ انار کے درختوں کے نیچے صوفے پر نیم دراز ایک ادھیڑ عمر کا انگریز ترنگ میں آ کر اپنی بھدی آواز میں بار بار اس نغمے کے الفاظ دہرائے جا رہا تھا۔"میں نے اسے کیپری کے جزیرے میں ایک پرانے وال نٹ کے درخت کے نیچے پایا۔ موسم گرما تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ نیلے اطالوی آسمانوں کے نیچے میں نے اس سے کہا۔ خاتون میں محض

ایک لاابالا اسپلانی ہوں ــــ خاتون ــــ میں ایک ــــ ایک گھوڑا ہوں؟ نشے اور غنودگی کی جھونک میں وہ انگریزوں میں لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ ٹیرس رفتہ رفتہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔

"اوجینرس ــــ کتنی الف لیلیٰ ایسی رات ہے یہ" ــــ بالکونی کی ریلنگ پر جھکی ہوئی ایک امریکن لڑکی نے اپنے قریب کھڑے ہوئے روسی سے کہا۔

"غوں" - روسی نے حلق میں سے کوئی آواز نکال کر جواب دیا۔ پھر وہ دونوں بار کی طرف چلے گئے۔

ہوٹل کی ساری عمارت پر پھر وہی سناٹا طاری ہو گیا۔

پھر صبح ہوئی۔ پھر شور مچا۔ خود رو پہاڑی پھولوں کی جھاڑیوں میں نیلے اور سرخ پرند چہچہائے اور پورچ میں کھڑی ہوئی موٹریں ہارن بجاتی درختوں کے نیچے سے گذرتی ہوٹل کے پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

موٹروں کے ہارن کے شور نے اسے جگا دیا۔ وہ ایک طویل انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ صبح کی چاء پلنگ کے برابر کی میز پر دیر سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اُس نے اخبار اٹھا کر دریچے سے باہر دیکھا۔ نیچے صحن میں نارنجی تانبے کا فرشتہ اپنے زنگ آلود بربط پر اپنے شکستہ پر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا اور دریچے کے شیشوں پر انار کے پتے صبح کی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔

"آقائے سلیم" دروازے پر بڑی مودبانہ دستک ہوئی

جب وہ اپنے اردلی سے بات کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت باہر سرخ چٹانوں اور انجیر کے باغوں اور لامتناہی اکتائے ہوئے کوہستانی

راستوں پر ایک اور دن طلوع ہو چکا تھا۔

اور صبح ہوتے ہوتے بہار کے نارنجی آفتاب کی کرنوں میں ندی کا پانی بالکل سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا اور پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ ندی بڑے سکون، بڑی خاموشی سے رواں تھی۔ اس کے کنارے کنارے درختوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیاں بالکل ساکت تھیں اور درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے تھے۔

دن بھر ہوا امرودوں اور جامنوں کے کنجوں میں یونہی کاہلی سے سرسراتی رہی جیسے فضا میں بڑھتی ہوئی گرمی کی وجہ سے اسے نیند سی آ رہی تھی۔ آم کے پیڑوں کی ڈالیاں چھوٹی چھوٹی ہری کیریوں کے بوجھ سے ٹھنڈی نم زمین تک جھک آئی تھیں اور جن پیڑوں پر ابھی بور باقی تھا۔ ان کے پتوں میں موسم کی اسی نئی حدت سے بچنے کے لئے کوئلیں جا چھپی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چلا اٹھتی تھیں یا ان کنجوں میں سے گذرتا ہوا کوئی لڑکا 'کو او' کی آواز نکال کر اگر ان کی نقل کرتا تو بڑی مستعدی سے اس کا جواب دے دیتی تھیں۔ پھر دھوپ ڈھلنے لگی اور موسم کی اس نئی نئی گرمی میں کچھ کمی ہوئی تو پروائی ہوا بے طرح جھنجھلاہٹ کے ساتھ درختوں سے جا ٹکرائی اور آم اور جامن کے ان کنجوں میں پہنچ گئی جہاں کوئلیں چھپی بیٹھی تھیں۔ کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں — پتوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کی سنسناہٹیں جیسے کوئی کہتا سنائی دیا لیکن دراصل یہ امرودوں کے باغ کے رکھوالے کا لڑکا تھا جو گھاٹ کی شکستہ سیڑھی پر لیٹا آم کے پتے کی سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہوا درختوں میں دیر تک اپنا مدھم سا شور پیدا کرتی رہی اور اس طرح وقت کے اس

بہت بڑے۔ پاگل کر دینے والے صحرا میں ایک دن اور طلوع ہوا۔ اس سرخ، گرم اور
نڈھال آفتاب کے ساتھ ساتھ گھسٹتا رہا اور پھر ندی کے اس پار اندھیرے میں جا گرا
لہروں کی سطح، ہرے پتوں کے جنگل اور اس کے کنارے کنارے منڈلاتے ہوئے سرخی
راستے پر جھٹ پٹے کے وقت کی تاریکی بکھرنے لگی (امبرپور راج کا انور اعظم اس وقت
جب پہلی بار ادھر سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ گو بارشوں کا مہینہ ابھی بہت دور تھا لیکن
گرد آہا راج کے علاقے میں چاروں طرف خوب ہریالی تھی۔ وہاں پر دور دور تک آم کے
باغ پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان سے وہ ندی نما گڑا بل کھاتی گزرتی تھی اور
وہ سڑک جس پر سے انور اعظم کی نیلی ٹو سیٹر گزر رہی تھی بہت خاموش اور صاف شفاف
تھی اور کبھی کبھی اس سڑک پر سے دیہاتی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی زرد اور
گرد آلود لاریاں شور کرتی نکل جاتی تھیں اور وہاں پر تالاب اور ادھر کے کھیتوں کے پرے
ایک نہر تھی جو دور نیپال کی سرحد کے قریب اس ندی میں سے نکالی گئی تھی اور اس
نہر کے پاس ہائیڈرو الیکٹرک کا چھوٹا سا پاور ہاؤس تھا اور دور سے نہر کے کنارے
کھڑا ہوا پھولس کی چھت کا سفید ریسٹ ہاؤس نظر آتا تھا جس میں اکثر سپرنٹنڈنگ انجنیئر
یا ضلع کے دوسرے حکام آ کر ٹھہرتے یا پکنک منانے والے خاندانوں کی ٹولیاں یا پی۔ ٹی
سی کے دستے رک جاتے۔ پھر آم کے ان باغوں کے چاروں طرف کچی منڈیروں کے
کے ساتھ ساتھ ایکھ کے جھنڈ کھڑے تھے۔ وہاں پر ہریالی تھی اور ٹھنڈک اور سکون
اور کیلے کے جھومتے ہوئے جھنڈ میں ٹھاکر راجندر پرتاپ سنگھ کے پرانے مندر کا
بدرنگ جھنڈا پروائی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کا رخ ٹھاکر صاحب
کی نئی کوٹھی کی سمت تھا۔ وہ شیو جی کا مندر تھا اور شیو جی کی کنائی ہوئی خوفناک، سرخ

مورتی کا گول پتھر دن بھر ڈھیروں پانی میں نہاتا رہتا تھا اور وہ پانی پتھر کے سینڈور میں مل کر فرش پر سے بہہ بہہ کے مندر کے چبوترے کے چاروں طرف گیندے اور گل ہزارے کی کیاریوں میں جذب ہو جاتا تھا اور رات کے سناٹے میں ٹھاکر صاحب کی کوٹھی میں سے کیرتن کی آواز بلند ہوتی تھی ــ چلو چلوری سکھی متھرا نگری۔ وہ مرلی بجاتے آتے ہیں اور پہروں کھڑتال کے ساتھ کیرتن یا بھجنوں کے بول ایک ہی لے میں دہرائے جاتے تھے اور ڈھیروں گائیں اور کالی بھینسیں اور بھورے بھورے کالے پیلے سوروں کے غول نظر آ رہے تھے۔ اکثر کسی بھینس کی پیٹھ پر کوئی کالا بھتنا ایسا بچہ اسے لکڑی سے مارتا مارتا ندی کی طرف جاتا دکھائی دے جاتا اور اس کو تار کی سرمئی سڑک پر انور اعظم کی نیلی ٹوسیٹر کے برابر سے بڑے بڑے کمانڈو اور جیپ اور ٹرک زناٹے سے فیض آباد چھاؤنی کی طرف نکلتے جا رہے تھے اور اس سڑک سے ذرا پرے ایک ڈیڑھ فرلانگ بھر کا سرخ بجری والا راستہ نظر آ رہا تھا جو کرنا راج اور چھاؤنی کی آبادی شروع ہونے سے ذرا پہلے اس زرد رنگ کی پرانی کوٹھی کی طرف جاتا تھا جس کے باغ میں ڈھیروں گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں تھیں اور جس کے کنارے پر ایک بورڈ لگا تھا۔ "یہ عام راستہ نہیں"۔

اور جنگل کے کنارے کنارے منڈلانے والے اس سرمئی راستے کے سرے پر اس نے اپنی ٹوسیٹر روک لی۔ کیونکہ دفعتاً اسے خیال آیا تھا کہ ستر میل کا سفر طے کرنے کی وجہ سے انجن گرم ہو گیا ہے اور ریڈی ایٹر کو تازہ ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔ لیکن کیلے کے جھنڈ میں چھپی ہوئی ٹھاکر صاحب کی نئی کوٹھی کے سارے دروازے بند تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھاکر صاحب ابھی اپنی بھانجی کی شادی نپٹا کر بلرام پور راج سے واپس

تشریف نہیں لائے ہیں چنانچہ اس نے گرم انجن دوبارہ اسٹارٹ کیا اور گھاگرا ندی کے کنارے کنارے چھاؤنی کے انگریزی کلب کی طرف نکل گیا شفق کے سائے میں کار آگے بڑھاتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ یہی سڑک اسّی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یونہی بل کھاتی اور خاموش، کرواہا راج کی غفران منزل کے بڑے پھاٹک تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ کیا نئی یا عجیب بات تھی۔ لیکن بہرحال تھی۔

پھر وہاں وہی سکوت طاری ہو گیا جس میں صبح و شام صرف ٹھاکر راجندر پرتاپ سنگھ کے مندر کے سنکھ کی آواز نکل ہوتی تھی جس کے ساتھ ساتھ چھوٹے ٹھاکر کے دونوں السیشین کتے اپنی آواز ملا کر زور زور سے بھونکنے کی مشق کرتے تھے۔ پروائی ہواؤں میں مندر کا گلابی جھنڈا لہرایا گیا۔ شام کا اندھیرا بڑھتا گیا۔

اس سکوت اور اس تاریکی میں گھنگھریالے بالوں والی شہلا رحمن آہستہ آہستہ قدم رکھتی سرخ بجری والی روش کے سرے پر آکھڑی ہوئی اور پرانے نگوتوں کی ایک شکستہ اور نیچی سی دیوار پر جھک کر سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔ سامنے جدھر ندی بہہ رہی تھی اس آم کے جھنڈ تھے اور جوہی کے پھولوں پر بھونرے گونج رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس جگہ کھڑی اپنی نظم کی آخری دو سطریں موزوں کرنے کی کوشش میں منہمک رہی "بجائے ان پر سے کتنے طوفاں گذر کے راہیں بنا رہے ہیں۔ گذر کے راہیں بنا رہے ہیں" سرخ آفتاب مولسری اور چمپا اور جامنوں کے پیچھے ندی کے گلرنگ پانیوں میں لڑکھڑا کر گر چکا تھا اور لمبے لمبے چپ چاپ سائے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔

ایکھ کے کھیت کو پار کر کے دو سائے اس راستے کی جانب آتے دکھائی دیئے

ان دو انسانوں نے چھینٹے چلاتے رنگوں والے اسکارف اور گہرے رنگوں کے دھاریدار سوٹ پہن رکھے تھے اور غالباً کسی ہمسایہ زمینداری کے لڑکے تھے۔

"ہلو۔ ار۔ تسلیمات عرض ہے شہلا بیگم۔" ان میں سے ایک نے دیوار کے نیچے پہنچ کر کہا۔

"آداب۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ تازہ ترین مصرع دماغ میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔

"آپ الٰہ آباد سے کب تشریف لائیں۔ میرا خیال تھا آپ ابھی وہیں ہیں۔" دوسرے نے کہا

وہ چپ رہی۔

"آپ کو کچھ پتہ ہے کہ واہا آج والے اپنے سفر پر سے لکھنؤ واپس آ گئے؟" پہلے نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ چچا میاں کو معلوم ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ ۔ میرا خیال تھا ۔ اچھا خیر ۔ کیا آپ کے چچا میاں اندر تشریف رکھتے ہیں؟ شاید آپ اندھیرے میں مجھے پہچانیں نہیں۔ میں چودھری شمیم ہوں۔ سندیلے کا چودھری شمیم۔ وکیل صاحب اگر الٰہ آباد سے آ گئے ہوں ۔"

"بھئی وہ اندر ہی ہوں گے۔ آگے جا کر معلوم کر لیجئے۔"

وہ دونوں تکلفاً ہنستے ہوئے کوٹھی کی طرف چلے گئے۔ جدھر چنبیلی کی جھاڑیاں تھیں

"ہونہہ"۔ اس نے جھک کر آکاس بیل کا ایک پتہ توڑا اور دیوار پر سے اتر آئی اور گھاگرا کی شفق رنگ لہر دل کو دیکھتے ہوئے اس نے تخیلات کا سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ لینا چاہا (اس نئی نظم کو بر تبند رکمار روہتا نے کہا تھا کہ وہ الٰہ آباد کے اسٹوڈیوز سے لکھنؤ ریڈیو کے لئے ریکارڈ کروا دے گا۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے چچا میاں کے ہاں ضلع فیض آباد کے اس خوبصورت علاقے میں آ گئی۔

جہاں چچا میاں نے کروآہا واج والوں کی یہ کوٹھی کرائے پہلے رکھی تھی۔ یہاں کی یہ نغمہ ریز، شعر ریز دور پرسکون فضا، یہ کوتیتا کے ہرے کنج اس کے لئے بہت ہی (یعنی کہ موزوں تھے) نجانے ان پر سے کتنے طوفاں — کتنے طوفاں — وہ پھر شعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بٹیا چلیئے کھانا ٹھنڈا ہوت ہے" برآمدے میں سے نوکر نے آواز دی چچا میاں غروب آفتاب کے وقت ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ تاکہ کھانے کے کمرے کے لیمپ پر زیادہ پتنگے نہ جمع ہوسکیں۔

اسے اندر جانا پڑا۔

•

• یہ سب محض جسم ہی جسم ہیں۔ صندلی۔ گرم۔ خوبصورت۔ روح کہیں نہیں ملتی۔ کہیں نہیں ملتی۔" شانتی نکیتن کے اوشبر لہری نے اکتا کر برش ایک طرف رکھ دیئے اور دیوداروں کے پرے پہاڑی نالے کو دیکھنے لگا جس کے شفاف، پرشور دھارے میں راج ہنسوں کی قطار کا عکس لرز رہا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ہرا درختوں میں تھکی تھکی انگڑائیاں لے رہی تھی اور چپکے چپکے روتی جاتی تھی

• یہ تو بڑی پرانی پکار ہے، بھائی۔ تمہیں روح کہاں ملے گی۔ ان ٹیڑھے ترچھے نقوش اور تیز رنگوں میں تم زندگی کو سمیٹ لاتے ہو اور پھر روح کی تلاش میں نکلتے ہو۔ تاریک گلیاں جہاں بارش کے ٹھہرے پانی میں سڑک کے مدھم لیمپوں کا عکس جھلملاتا ہے اور جہاں سے وائلن کے بیمار سُر بلند ہوتے ہیں۔ جگمگاتے کاشانے جہاں گربا ناچ ناچے جاتے ہیں اور کوتیتائیں سجتی ہیں۔ یہ ہرے جنگل اور اکیلے پہاڑوں کی وادیاں — ان سب جگہوں میں تم منزلِ لیلیٰ ڈھونڈنے آئے ہو۔ بیوقوف ہو تم۔ روح تو محض آرٹ

میں ہے۔ انسانوں میں نہیں ہے" وہ بھی اکتا کر چپ ہو گیا۔

اوشیر وقت گذارنے کے لئے اس کا اسکیچ بنا رہا تھا۔ لیکن اب اُن کے چاروں طرف اندھیرا ابھرتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس چٹان پر بیٹھے رہے۔ وہ ساری دنیا گھوم چکے تھے۔ لیکن انہیں کہیں بھی اپنا گھر نہ ملا تھا۔ انہوں نے پہاڑی نالے کے اس پار نظر ڈالی۔ ایک بے پروا، مہکتی، مہکتی دُنیا دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں رقص گاہوں کے سرخ پردوں کے پیچھے مرمریں ستونوں پر رقصاں پرچھائیاں لرزتی تھیں اور موسیقی کا ابلیس چیختا تھا۔ جہاں قہوہ خانوں میں سنگ مرمر کی میزوں کے گرد چھوٹے چھوٹے انسان اپنی اپنی مضحکہ خیز مسرتوں اور دکھوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ جہاں جوہی کے گجروں میں لپٹی، کنول کے پھولوں ایسے پیروں والی راجکماریاں لکشمی کے آگے جھم جھم کی آرتی جگاتی تھیں۔

خودرو پہاڑی پھولوں کے انبار سنبھالے، قہقہے لگاتی چند لڑکیاں آبشار کی سمت جاتے ہوئے ان کے نزدیک سے گذریں۔ ان کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور پھولوں کے گچھے اور کچے پہاڑی پھلوں کی ڈالیاں جو انہوں نے راستے میں توڑی تھیں۔ ان کے پیچھے پگڈنڈی پر گرتی جا رہی تھیں اور وہ انہیں روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

اوشیر اپنی اسکیچ بک پر جھکا رہا۔ اس کے بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ اس کی آنکھوں پر آ گری۔

لڑکیوں نے ہنس کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب یقیناً یہ اس کافی ہاؤس والے آرٹسٹ کی طرح سامنے آ کر کہے گا۔ میں نے آپ کی یہ تصویر آپ کی اجازت کے بغیر بنا لی ہے۔ اس گستاخی کو معاف کیجئے اور اس پر اپنے دستخط کر دیجئے۔ لیکن وہ

اسی طرح چپ چاپ چٹان پر بیٹھا رہا۔

"اسکیچ بنانا بھی بڑا دلچسپ مشغلہ ہے"۔ لڑکیوں نے آپس میں بڑی بے تعلقی سے رائے ظاہر کی اور پھولوں کو سنبھال کر آگے چلی گئیں۔

—— ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ نئے دن آتے ہیں نئی راتیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے۔ آندھیاں اٹھتی ہیں۔ انسان جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ دل ٹوٹتے ہیں اور جڑتے ہیں کسی کو موت آتی ہے۔ کسی کو نہیں آتی۔ نیند بھی نہیں آتی۔ یہ چکر یونہی چلتا رہے گا۔ سب انٹیجت ہیں۔ سب دکھی ہیں۔ یہ سایہ دار راستے، ان کے کنارے کھڑے ہوئے ہرے درخت، دھان کے کھیتوں اور چائے کے باغوں میں کام کرتی، برہا کے گیت الاپتی ہوئی لڑکیاں، خچروں اور بیل گاڑیوں کی قطاریں، یہ سب گزر جاتے ہیں۔ کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اگلے لمحے ہم سب ایک دوسرے آسمان کے نیچے ہوں گے۔ ایک دوسرے ہوا کے جھونکے ان پتوں کو چھوئیں گے ان لڑکیوں کے آنچلوں کو ان کے بالوں کو اڑائیں گے۔ ہوائیں پرانی مانوس خوشبوئیں اپنے ساتھ لاتی ہیں اور انہیں ہمارے آس پاس بکھیر کر آگے چلی جاتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کو چھیڑنے، انہیں دوسری یادیں دلانے، کاش ایسا ہوتا —— ایسا ہوتا ——

کاش بہار ہی نہ آتی۔

"وہ مارچ کا مہینہ تھا"۔ اوشیر نے اسکیچ بک ایک طرف رکھ کر کہا "جب جھیلوں میں نیلے اور سفید پھول کھلتے ہیں اور وہ خوبصورت تھی۔ وہ امرتا شیر گل کی طرح سیدھی مانگ نکال کر اپنے لمبے، سیاہ اور سیدھے بالوں کو پیچھے سمیٹ لیتی تھی اور ڈریچ

فنکاروں کی تصویر کی ایسی نظر آتی تھی۔ تم نے کبھی دیکھا ہے کہ گلاب کے پھول اپنی جھاڑیوں کے بجائے گلدان میں زیادہ رنگین، زیادہ روشن اور جاندار لگتے ہیں۔ اندھیرے میں جگمگاتے ہوئے ان کے سُرخ شگوفے۔ ان کی تیز خوشبو۔ ان کا گہرا مخملیں رنگ۔ وہ ان کرداروں میں سے تھی جو سارناتھ کی دیواروں اور وشوامجاتی کے صنم کدوں کے نقوش میں نظر آتے ہیں اور راماین کی پراسرار کالی راتوں میں وینا کی گونج اور دھمک کے ساتھ یک بیک جاگ اُٹھتے ہیں اور پھر اس اندھیرے میں اپنی بڑی بڑی ترچھی آنکھیں کھولے زندگی کو چپ چاپ تکتے رہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کہیں آگ لگ گئی ہے اور اس کے شعلوں کی سُرخ پرچھائیاں آنکھوں میں گھسی جا رہی ہیں اور دم بالکل گھٹا جاتا ہے اور میں نے سوچا۔ یہ زندگی ہے۔ زندگی کی جو تصویر میں بنانا چاہتا تھا۔ زندگی جو مجھے کہیں نہ ملتی تھی۔ وہ ہمالیہ کے درختوں تلے جنگل کے دیوتاؤں کے ناچ میں مصروف تھی۔ میں نے ایک دیودار کے پیچھے چھپ کر اسی وقت اس کا اسکیچ بنایا اور بعد میں مدتوں اس میں رنگ بھرتا رہا۔ کیسے کیسے رنگ تھے وہ سیٹھ دادا مجھ سے ہنس کر کہتے۔ تم تو چھوکرا ایک دم پاگل کا موافک ہے۔ ایسا ایسا بے مطلب تصبیر بناتا جس کا کوئی پچاس روپیہ بھی نائیں دیگا پھر وہ موسم گل کی شہد کی مکھیوں کی طرح ہمالیہ کی کھلی فضاؤں میں ناچتے ناچتے دیوداروں کے سایوں میں غائب ہو گئی۔ وہ مجھے پھر کہیں نظر نہ آئی۔ اس تصویر پر گرد جم گئی۔ اس کے پیسٹل کے سارے ذرّے گر گئے۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے نقوش مدھم پڑ گئے"

اوتیسر خاموش ہو گیا۔ شام کے مکمل سکوت میں پہاڑی نالے کا شور تیز ہو گیا۔

وہ بھی اوتیسر کے قریب چٹان پر چپ چاپ بیٹھا اپنی کالی پلکیں جھپکا رہا تھا۔ شمالی ہند کی اس ہری وادی میں اس کا پڑاؤ پچھلے ہفتے سے تھا۔ وہ بہت دور سے آ رہا تھا۔ بہت

دنیا گھوم کر وہاں پہنچا تھا اور اسے پھر وہاں سے آگے، جانے کہاں کہاں جانا تھا۔ کیمپ کی وجہ سے وہاں پر جنگل میں منگل ایسا لگ رہا تھا۔ غیر ملکی سیاح اور ہمالیہ کی ان خوبصورت چوٹیوں پر گرمیاں بسر کرنے کے لئے آنے والے لوگ آس پاس سے ٹہلتے ہوئے آبشار اور نالے کے کنارے آنکلتے تھے۔ سلیکس میں ملبوس اسکیٹنگ کی شوقین لڑکیاں قہقہے لگاتی نالے کے پل کی ہموار سطح پر سے پھسلتی ہوئی گذرتی رہتی تھیں۔ ایسے ہی عارضی کیمپ، پڑاؤ، سفر، پھر پڑاؤ۔ اس کی زندگی اسی رفتار سے آگے نکلی چلی جا رہی تھی۔ کہیں سے گھومتا پھرتا اس کا پرانا دوست ادشیر اس وقت وہاں آنکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کینوس اور ادھوری تصویروں کا تھیلا تھا۔ اس کے پاؤں خاک آلود تھے۔ اس کی آنکھیں بیخواب تھیں۔

"سنتے ہو — میں جنوبی ہند کے ایک بڑے جاگیردار کی امریکن بیوی کی تصویر بنانے کے لئے یہاں بلایا گیا تھا۔ لیکن میں اکتا گیا ہوں۔ میں شاید وہ تصویر بھی ادھوری چھوڑ دوں گا وہ ہنومان جی کی شکل والا راجہ مجھے اس کا معاوضہ نہ دے گا۔ لیکن بھائی ہندوستان میں فنکاروں کو معاوضہ دینے نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ موڈل کے تخت پر بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پیتی جاتی ہے اور مجھے اپنی بے معنی باتوں سے اکتا دیتی ہے اور اس تصویر کو اون لکر یا فیشن اینڈ بیوٹی میں بھیجنے والی ہے۔ لیکن میں تو اب یہاں سے بھی چلا جاؤں گا" ادشیر نے دفعتہً چٹان پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟" اس نے پوچھا۔

"میں — میں غالباً لکھنؤ چلا جاؤں گا۔ آرٹ اسکول کے نیچے چنار کے درختوں اور سایہ دار روشوں میں گھری ہوئی سیّن دادا کی کوٹھی میری آخری جائے پناہ ہے اور

گومتی کے ساحل۔ بھائی تم نے کبھی گومتی کے پانی میں شفق کی سرخ پرچھائیوں کو لرزتے دیکھا ہے؟ ___ لیکن ابھی تو میں ہردوار جا رہا ہوں۔"

"ہردوار؟"

"ہُم۔ ہردوار بھی بہت بڑی جائے پناہ ہے۔ پائین کے ہرے جنگلوں میں چھپی ہوئی ہمالیہ کی اونچی، اکیلی برفیلی چوٹیاں اور زنیر رو ندیاں۔ ہر کی پوڑی۔ رشی کیش ___ وہاں غالباً آتما کو سکون ملتا ہے۔"

"آتما کو؟"

"ہُم ___ اوم شانتی۔ شانتی۔"

"کیا؟ ___ کسی لڑکی کا نام ہے؟" اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر بے پروائی سے پوچھا۔ اوشیر ہنس پڑا۔

پھر اس نے سوچا۔ اوشیر بھائی کیوں اتنے دکھی ہوتے ہو۔ چلنے دو یہ زندگی کا چکر۔ ان دور دراز کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے راستے چلی گئی۔ جانے کون دیس کو۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آئیگا کہ ایک مرتبہ ایک گمنام غیر ملکی ہوٹل میں اس نے ایک اجنبی کے ساتھ انار کے درختوں کے تلے ایک شام گذاری تھی۔ اسے شاید یہ کبھی یاد نہ آئے گا۔ اس کا جانے کیسا گھر ہوگا۔ کون لوگ ہوں گے۔ اس کی زندگی کا پس منظر کیا ہوگا۔ اس کی اپنی دلچسپیاں ہونگی اپنے ساتھی ہوں گے۔ اپنی دنیا ہوگی۔ اس نے اس تخیل پرست بنگالی لڑکے سے کہنا چاہا۔ کیوں اتنے رنجیدہ ہو اوشیر لہری۔ تم روح کی تلاش میں کہاں بھٹکتے پھروگے۔ چلو آگے چلیں۔ راستے کے اگلے قیام میں ہمیں عمدہ اسکاچ شراب ملے گی اور اچھی، دلچسپ

شور مچانے والی، بشاش سفید فام لڑکیاں ملیں گی جو تمہیں ہٹی گریبل کے نئے گیت سنائیں گی
اور تمہارے ساتھ رقص نا چیں گی۔

وہ ادشیر کی طرف مڑا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ چٹان خالی پڑی تھی۔ ادشیر اپنا کینوس
کا تھیلا لے کر وہاں سے جا چکا تھا۔ چٹان پر کچھ ٹوٹے ہوئے برش اور رنگوں کے خالی
ٹیوب بکھرے رہ گئے تھے۔

رات کی پرچھائیں وادی پر پھیل گئی اور ہوائیں چپکے چپکے روتی رہیں۔

•

دفعتہً ہواؤں کے غمگین راگ دھیمے پڑ گئے اور رات کے گونجتے ہوئے اندھیارے
میں بہت سی شگفتہ جوان آوازیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ گرمیوں کی رات کا جو ناقابلِ برداشت
سکوت فضا پر طاری تھا اسے ان آوازوں نے کچھ دیر کے لئے منتشر کر دیا اور مدھم آسمان
کے ٹمٹماتے ستاروں کے تلے کئی چھوٹے چھوٹے چمپئی اور سفید رنگت والے ہاتھوں نے
مٹی کے دیئے روشن کئے اور انہیں ایک پیتل کی تھالی میں رکھا۔ تاکہ اس اندھیرے میں
کچھ کمی ہو سکے اور وہ سب دور دور کی پگڈنڈیوں اور تاریک راہوں اور چھوٹے چھوٹے
گھروں میں سے نکل کر ان دیوؤں کی روشنی میں دریا کے کنارے ٹھنڈی گھاس پر آ
بیٹھے۔ وہ طرح طرح کے لوگ تھے۔ رنگ محلوں میں رہنے والے راجکمار اور راجکماریاں
تھیں اور تپتی مٹی پر پیدل گھومنے والے نوجوان تھے اور سفید ساریاں پہنے خاموش
آنکھوں والی لڑکیاں تھیں۔ جن کے بالوں میں جوہی کے شگوفے سجے تھے۔ مٹی کے چراغوں
کی جھلملاتی روشنی میں ان کے دل دھڑک رہے تھے اور ان کے نوجوان چہروں پر
امید اور مایوسی اور بے یقینی اور خود اعتمادی کی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں

وہ بہت کچھ سوچتے تھے۔ بہت کچھ کر چکے تھے۔ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ ان کے چاروں طرف ایک بہت بڑی اندھیری دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اس دنیا سے وہ لڑتے آئے تھے۔ اس دنیا کے لئے انہیں ابھی اور لڑنا تھا۔ ان کے درمیان انقلابی خیالات والے بھی تھے۔ اعتدال پسند بھی اور قنوطی بھی۔ بہت سے اپنے میں ہمت نہ پاتے تھے کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں سب کہہ اور کر ڈالیں۔ بہت سے ہر سمے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شکستوں اور ناکامیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی ان سب میں ایک جذبہ تھا۔ ایک ہمت تھی۔ زندگی کی حرارت تھی۔ ایک چھوٹے سے گروہ کی زندگی کی نہیں، بیکروڑوں انسانوں کی زندگی تھی، اس میں گرمی تھی، طاقت تھی، دیوانگی تھی، زندہ رہنے کا عزم اور مستقبل کی اچھی طاقتوں پہ بھروسہ۔ ان کے قافلوں نے بڑے بڑے معرکے فتح نہ کئے تھے۔ ان کے آگے بڑھنے سے جو ریکھائیں بن رہی تھیں۔ ان کو نئی اندھی اندھیری آندھیاں مٹاتی جاتی تھیں۔ لیکن وہ ہمت نہ ہارتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتے تھے۔ یہ نوجوان لوگ، ان کے شائع کئے ہوئے رسالوں اور مضمونوں کی اپیل ان کی آرگنائز کی ہوئی آرٹ کی نمائشوں کے ہجوم، ان کی تنظیم کی ہوئی ہڑتالوں اور مظاہروں کی کامیابی۔ ان میں سے بہت سے قید کی مصیبتیں جھیل چکے تھے۔ بہت سے پولیس کی سنگینوں کا مقابلہ کر چکے تھے۔ بظاہر یہ بہت معمولی چیزیں تھیں، لیکن انہیں اس سے کتنا سکھ کتنی تقویت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے سامنے ایک آدرش تھا ایک تصور تھا۔ ایک خیال تھا۔ اس آدرش کے لئے اب تک بہت خون بہایا جا چکا تھا۔ دنیا کے سامنے نظریں نیچی کرنی پڑتی تھیں۔ عمل اور ردِ عمل کے چکر میں پڑ کر ایک عالم دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ بہت دفعہ ایسے وقت آتے تھے کہ ان کی ہمتیں ان کا ساتھ چھوڑ دیتیں ان کے

جی چھوٹے ہو جاتے۔ یہ اندھیرے، پرسکوں کھلے میدانوں کے جلسے، یہ پربھات پھیریوں کے گیت، یہ پرجوش تقریریں اور بلند ارادے، یہ سب ایک حماقت، ایک فریب معلوم ہوتے لیکن وہ مٹی کے دئے پھر جل اُٹھتے۔ ان کا جذبہ پھر واپس آ جاتا۔ ٹیگور کے گیت کی جھنکار پر ان کی آنکھیں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ غالباً یہ شدید قسم کی جذباتیت تھی۔ لیکن جذباتیت کمزور فانی انسانوں کے لئے بہت بڑا سہارا ہے۔ انسان محض مشین گن کبھی نہیں بن سکتا۔

آج کی رات وہ پھر گومتی کے کنارے گھاس پر اکٹھے ہوئے تھے۔ لڑکیاں ایک طرف کو ٹولی بنائے بیٹھی تھیں۔ کچھ لڑکے ساحل پر پڑی ہوئی ٹوٹی کشتیوں پر جا بیٹھے تھے۔ پچھوا ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی اور اس کی زد سے بچانے کے لئے لڑکیوں نے چراغ اپنے آنچلوں کے نیچے رکھ دئے تھے۔ ان میں سے بہت سے تھکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بے خواب تھیں۔ وہ گاؤں گاؤں گھومے تھے۔ وہ رات رات بھر جاگے تھے۔ جس زہر کو پھیلنے سے وہ روکنا چاہتے تھے۔ وہ اب بہت اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ ان کی کوششوں کو غلط روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض کو غدار اور قوم فروش کہہ کر گالیاں دی جاتی تھیں۔ ان سے پوچھا جاتا تھا۔ بھائی تمہیں ہیڈ کوارٹرز سے کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ میاں جتنے روپے تم وہاں سے لیتے ہو۔ اس سے دوگنے ہم سے لے لو لیکن خدا را قوم کو نہ بیچو۔ قوم کو قدم قدم پر دوسروں کے ہاتھ بک جانے کا سخت خدشہ تھا۔

میٹنگ دیر تک جاری رہی۔ پھر یکایک ایک طرف سے ایک نووارد نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا "میرے نوجوان رفیقو"۔

"میاؤں" — ایک آواز آئی۔

"ارے یہ یونیورسٹی کا اسٹائل کس نے شروع کر دیا" ایک لڑکی نے چپکے سے پوچھا

سب نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن مجمع بڑی سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔

تقریر پھر شروع ہوئی "میرے نوجوان رفیقو۔ آج ہم اس لئے یہاں جمع ہوئے ہیں"

"کہ آپ ہمیں بور کیجئے" کسی نے چپکے سے کہا۔

تقریر جاری رہی۔ "ہم دیکھتے ہیں کہ گو دنیا میں فاشیت کو فی الحال شکست ہوئی ہے۔ لیکن فاشسٹ ذہنیتیں ہمارے درمیان ہمارے خلاف برسرپیکار ہیں۔ لیکن خدا کی قسم رجعت پسندوں کو شکست ہوگی۔ ہمیں ۹ اگست یاد ہے۔ ہمیں بنگال یاد ہے۔"

"ارے ۹ اگست کو تو یہ مسوری میں مکرجی کی لونڈیا کے ساتھ تفریح کر رہا تھا۔"

"یہ کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں کمیونسٹ نہیں ہے۔ ابھی خدا کی قسم کھا رہا تھا۔"

"یہ باہر کے عناصر کہاں سے آگئے۔ انہیں نکالو۔"

"بھائی کب تک باہر اور اندر کے چکر میں رہو گے۔" نوجوان ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے تھے اور اب تھوڑی دیر کے لئے ہنسنا چاہتے تھے۔

"روشی ڈارلنگ تم کب آئیں؟" لڑکیوں نے بھی اکتا کر آپس میں باتیں شروع کر دیں۔

کچھ دیر بعد غیر ملکی لیڈر نے اپنی تقریر ختم کی۔ مجمع میں بے چینی سی پھیل گئی۔ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے پرے سے ایک اور انسان اندھیرے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟ چرکٹ معلوم ہوتا ہے۔ بالکل چڑیماروں کی شکل۔" لڑکیوں نے چپکے سے کہا: "ہش۔ سنو تو وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"میں مس عرفان علی سے پھر درخواست کروں گا کہ وہ نیو آیرا کے اس مضمون کے متعلق اپنے پرچے کی آئندہ اشاعت میں معذرت فرمائیں جس میں انہوں نے خاکساری

پارٹی پر حملہ کیا ہے۔"

"ارے بھئی آپ کی تعریف؟"

"ارے یہ تو سید افتخار صاحب ہیں۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں قبلہ"

"سید صاحب فاختہ اڑائیے۔ نیوا براسے آپ کو کیا مطلب"۔ پچھلے مقرر کی تقریر کی وجہ سے وہ سب اپنے آپ کو بیحد بشاش محسوس کر رہے تھے۔

"میں محترمہ اڈیٹر صاحبہ سے خود بات کرنا چاہتا ہوں"۔ وہ گرجا۔

"یہ تو کوئی فضتہ کالمسٹ جان پڑتا ہے"۔ کسی نے آہستہ سے کہا۔

"جی نہیں میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دشمنوں کا دو پیسے لے کر اپنا ضمیر فروخت کرتے ہیں"۔

"اپنے الفاظ واپس لیجئے گا قبلہ"۔

"بھائی تم ہماری میٹنگ میں شرکت کر کے ہم ہی سے لڑنے آئے ہو"۔ کسی اور نے رسان سے اس سے کہا۔

"ٹھہریئے بھائی میں سید صاحب سے خود کچھ کہنا چاہتی ہوں"۔ یہ اس لڑکی کی آواز تھی۔ جسے ابھی سید صاحب نے مخاطب کیا تھا۔ وہ مٹی کا چراغ اونچا اٹھا کر مجمع کے سامنے آگئی۔ سب بالکل خاموش ہو گئے۔

وہ دیر تک جو کچھ اسے کہنا تھا کہتی رہی۔ پھر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا پسندیدہ نغمہ شروع کیا جس کی لہریں انہیں ہمیشہ محسوس ہوتا تھا اس سکوت میں ستاروں کی موسیقی میں گھل مل کر فضا میں ابد تک لرزتی رہیں گی۔ پھر اپنی اپنی ٹولیوں میں بکھر کر باتیں کرتے ہوئے ان کا مجمع منتشر ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں سے سارے دیئے بجھ گئے اور گرم ہوا

کی بھیگتی ہوئی رات کی تنہائی اور سناٹا پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا۔

...

اور اس رات کردا ماراج کی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی زخشندہ بیگم نے خواب میں دیکھا کہ جانے کن انجانی پگڈنڈیوں پر چلتی وہ پھر اخروٹ اور انجیر کے درختوں میں گھری ہوئی اس الف لیلیٰ ایسی وادی میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں اس نے اس چھوٹے سے غیر ملکی ہوٹل میں ان دیکھے اور اجنبی لوگوں کے ساتھ ایک شام گذاری تھی۔ وہاں پر تیز سرخ، شعلہ رنگ پھول آگ کی طرح لہلہا رہے تھے اور اندھیرے راستوں پر جھاڑیوں کے پیچھے سبز جگنو چمکتے تھے اور چاند کے سائے میں رات کے پراسرار پرندے پرانے صحرائی کھنڈروں میں چلا رہے تھے۔ رات بہت پرسکون تھی اور رانگورا ور زرد گلاب کی بیلوں میں چھپے ہوئے شہ نشین میں گتار اور مینڈولین کی آواز بہت گہری ہوتی جا رہی تھی اور ایک پرانا گیت۔ جھیل کے کنارے مرغزاروں کے سارے خرگوش ساری گلہریاں سارے اود بلاؤ سب اکٹھے مل کر ایک پرانا گیت الاپ رہے تھے۔ میں نے اسے کیپری کے جزیرے میں دیکھا۔ میں نے اس سے کہا۔ خاتون، میں تو ایک للا بالا سیلانی ہوں۔ میں تو ایک خرگوش ہوں — اس کے سارے پیارے ساتھی اس وقت جانے کہاں بھاگ گئے تھے۔ گنی اور ڈائمنڈ اور کرسٹابل اور کرن۔ اور اس کا بھائی پی چو۔ اسے بہت گرمی معلوم ہوئی اور اس نے مسہری کا پردہ اٹھا کر پی چو کو آواز دی۔

"فوں — فوں — کیا بات ہے روشی —" برآمدے کے سرے پر لیٹے ہوئے اس کے بھائی نے ایک آنکھ آدھی کھولی اور کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

باہر رات کے پچھلے پہر کی مدھم چاندنی میں چھپا اور مولسری اور سرو کی قطاریں ساکت

کھڑی تھیں۔ دور اصطبل کے پیچھے ایک بھولا بھٹکا پتلا باریک آواز میں چلائے جا رہا تھا۔ گرمیوں کی رات کی اس طلسماتی خاموشی میں جبکہ ساری کائنات چاندنی کے گونجتے ہوئے سناٹے میں گہرے گہرے سانس لیتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی کالی بڑی بڑی آنکھیں کھولے ہری گھاس کے ٹھنڈے شبنم آلود قطعے کو دیر تک چپ چاپ پڑی دیکھتی رہی۔ بچپن میں گرمیوں کی ایسی ہی چاندنی راتوں میں یکایک آنکھ کھل جانے پر اسے اسی برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں طرح طرح کی مزید ارشکلوں والے جنتے نظر آیا کرتے تھے۔ نیند ہرگز نہیں آرہی تھی اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر صبح کا انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تھی۔ پی جو، اس کا بھائی گہری نیند سو رہا تھا ورنہ وہ اس سے ہی باتیں کرتی۔ پولو میاں جان کے ساتھ پہلو کے برآمدے میں سوتا تھا۔ ممی کی صبح کی نماز میں ابھی بہت دیر تھی۔ مولسری کی قطار کے پرے صحنچیوں میں ظفران منزل کی ساری مہریاں اور مغلانیاں خواب خرگوش میں مصروف تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ صرف وہ جاگ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے وہ دلچسپ خواب پھر سے دیکھنا شروع کر دینا چاہا لیکن سپنوں کی اس ٹوٹی ہوئی کڑی کو وہ کسی طرح نہ جوڑ پائی۔

تب اس نے دل میں کہا "لیجئے واہ۔ بڑا اچھا مذاق ہے۔"

پھر گومتی کے خوابیدہ پانیوں پر سے بہتے، مولسری اور رلت کی رانی کی ٹہنیوں میں سے گذرتے آدھی رات کی ہوا کے جھونکے آئے اور وہ سو گئی۔

صبح ہوئی اور سورج مولسری کے درختوں پر آ گیا۔ تب شعلہ پری نے صحنچی میں سے گل شبو کو آواز دی۔ "بٹیا کو ابھی نہ جگانا۔ رات اپنی میٹنگ میں گئی رہیں۔ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ گل شبو نے باورچی خانے کی طرف جاتی ہوئی زمرد سے کہا "بٹیا کو نہ جگانا۔ نہیں

بگڑ جئیں؟۔

زمرد نے برآمدے کی سیڑھیوں پر آکر عباسی خانم کو یہ سنایا۔

عباسی خانم نے آفتابہ تخت کے نیچے سرکا کر پائینچہ اڑسے ہوئے اندر بڑے کمرے میں آکر کنور رانی کو اطلاع دی۔ "بٹیا اور پی چو بھیا اب لگ سووت ہیں۔ آٹھ بجے جاگ کے چاء خاطر شور مچہئیں۔ پھر اتو موٹر پرات ہے۔"

کنور رانی نے تخت کے چوکے پر وظیفہ پڑھتے پڑھتے زور سے ہوں کی اور تسبیح سجدہ گاہ کے پاس رکھ کر اعمال کی ایک اور کتاب اٹھائی اور تعقیبات میں مصروف ہو گئیں۔

حالانکہ عباسی خانم کی یہ اطلاع ان کے لئے بے حد پریشان کن تھی کہ آج صبح صبح ہی ان کا موٹر پر آنا ہے۔ اگر عباسی خانم اپنی ناسازئ طبع کی وجہ سے اپنی صحنچی میں جا کہ ملنگڑی پر نیم دراز ہو جاتی تھیں تو غفران منزل کا سارا انتظام تھوڑی دیر کے لئے درہم برہم ہو جاتا تھا اور کنور رانی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک روز بھی عباسی خانم کے بنا غفران منزل کی زندگی کے کل پرزے کس طرح چل سکتے ہیں۔

عباسی خانم اپنی صحنچی کی چوکی پر بیٹھ کر کھٹاکھٹ ڈلی کاٹنے میں مشغول ہو گئیں شعلہ پری اور گل شبّو صحن کی نہر کے کنارے کنارے گذرتی ہوئی سرعت سے صبح کے ناشتے کے انتظام میں ادھر اُدھر آجا رہی تھیں۔

رات کی سکون بخش ٹھنڈی چاندنی کے مقابلے میں یکایک سورج کی تیز کرنوں کی چمک اس کی آنکھوں کو بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمبی انگڑائی لینے کے بعد پی چو کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک مزے سے سوتا

تھا اور شاید عمدہ عمدہ گھوڑوں اور نئی نئی قسم کے ہوائی جہازوں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ رخشندہ کا جی چاہا کہ پھر سے سو جائے۔ دونوں بہن بھائیوں میں اکثر زیادہ دیر تک سونے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اگر دونوں میں سے ایک کسی دوسرے کو سوتا دیکھ لیتا تو فوراً خود آنکھیں بند کر کے تلائی میں پھر منہ چھپا لیتا۔ یہاں تک کہ کنور رانی اندر سے آ کر جگاتیں یا عباسی خانم چائے کی کشتی لے کر آ کھڑی ہوتیں۔

پولو کا ایک کتا باہر مولسری کے پیڑ پر چڑھی ہوئی گلہریوں کی تاک میں درخت کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ پوٹو کب کا اٹھ چکا تھا اور غسلخانے میں گھسا زور زور سے گا رہا تھا۔

پھر وہ آخرکار اٹھ بیٹھی۔ اس کو جاگتا دیکھ کر فوراً ہی چوہی ایک زوردار انگڑائی لے کر پلنگ پر سے نیچے کود آیا۔

"سلاملیکم روشنی"۔ اس نے بڑے تپاک سے کہا۔ گویا آج ہی مدتوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔

"وعلیکم"۔ رخشندہ نے جواب دیا۔ گویا آپ سے مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی چھوٹے کنور صاحب۔

وہ دونوں عنقریب کسی مسئلے پر الجھ کر لڑنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ شعلہ پری چائے لے کر آ گئی۔

"بٹیا کو میاں بلا رہے ہیں"۔ اس نے کشتی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ کہدو ہم ابھی آتے ہیں"۔ رخشندہ نے جواب دیا۔

"واللہ مزا آئے گا۔ اب ڈانٹ پڑنے والی ہے تم پر"۔ پی چو نے بیحد خوش ہو کر کہا

"تم پر پڑے گی مجھے کیوں ڈانٹنے لگے میاں۔"
"دیکھ لینا۔ ابھی اوپر سے روتی ہوئی تھوتھنی لئے آؤ گی۔"
"روؤ تم خود۔ ہمیں تو میاں نے ایک آوپل خرید دینے کا وعدہ کیا ہے جناب"
"اوپل نہیں میاں تو تمہیں ڈیکوٹا پلین خرید کر دیں گے۔ اسپیشل ٹرین چھوڑ وائی جائے گی آپ کے لئے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ جیرکٹ رات والا سید افتخار نیوایرا کا قصہ ہے کہ میاں کے پاس پہنچ گیا ہے۔" پی چو نے کہا۔
وہ جلدی سے چائے ختم کر کے دوسری منزل پہ پہنچی۔
کروا مہاراج کے کنور عرفان علی خاں اپنے کمرے میں چھت سے لٹکتے ہوئے صوفے پر بیٹھے قانون شیخ میں مصروف تھے اور پیچوان گڑگڑاتے جاتے تھے۔
"تسلیم میاں۔" رخشندہ نے دروازے میں پہنچ کر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے کہا
"جیو بٹیا۔ تمہارے سر کا درد اب کیسا ہے۔ رات تم لوگ اپنی میٹنگ کی وجہ سے شاید بہت دیر تک جگتے رہے ہو۔"
وہ کنور صاحب کے پاس صوفے پر آ بیٹھی اور قالین پر پیر ٹکا کر جھولنے لگی۔ ان کی موڈ اچھی دیکھ کر وہ اوپل کا تذکرہ چھیڑنے والی تھی کہ کنور صاحب نے قانون شیخ بند کر کے تپائی پر رکھا ہوا ایک لفافہ اٹھا لیا۔
"لالہ یہ پرچہ کل شام امپریل ہاؤس سے لائے تھے۔ ان لوگوں نے شاید تم سب کو کھانے پر بلایا ہے۔ اپنی ممی کو دے دینا۔"
وہ دل میں بے حد خوش ہوئی۔ پی چو کو جلانے کا ایک اور بہت نادر موقع ہاتھ آیا تھا۔ لالہ یہ خط لائے ہیں۔ یہ بڑی ہی ڈپلومیٹک بات ہے۔ اس نے زینے پر سے

اترتے ہوئے سوچا۔

کنور رانی دعائے مشکل سے فارغ ہو چکی تھیں اور مہریوں کو دوپہر کے کھانے کے متعلق احکامات دینے میں مصروف تھیں۔

"ممی بہ لو امیر پور ہاؤس سے دعوت نامہ آیا ہے۔" لفافہ تخت پر پھینک کر وہ پی چچی کی تلاش میں بھاگ گئی۔

عباسی خانم دعوت نامے کا مضمون سننے کے لئے غرارے کے پائینچے سمیٹتی تخت کے کنارے پر آ بیٹھیں۔

کرواہاراج کی کنور رانی سلطنت آرا بیگم بہت موڈرن آدمی تھیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار کسی فلاور شو کی صدارت، یا ضلع کی سالانہ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے تقسیم انعامات یا گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم کی شرکت اور اسی طرح کے دوسرے بیکار فیشن ایبل سوشل فرائض جو ان کے سر آ پڑتے تھے۔ وہ بڑے مزے سے انجام دے لیتی تھیں لیکن اس کے باوجود پرانے وقتوں کی وضعداری ان میں اس حد تک موجود تھی کہ دن بھر میں کنور صاحب سے ان کی آفیشیل قسم کی ملاقات صرف دوپہر کے کھانے کے وقت ہوتی تھی۔ رات کا کھانا کنور صاحب باہر کے بڑے ڈائیننگ روم میں مصاحبین اور احباب کے ساتھ کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ضروری بات چیت صرف مہریوں یا کرواہاراج کے منیجر لالہ اقبال نرائن کے ذریعے کی جاتی تھیں یا پولو پی چچو اور رخشندہ میں سے کوئی اس فرض کو انجام دے لیا کرتا تھا۔

دن بچے میں سے کود کر رخشندہ پی چچو کے ڈریسنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھا شیو کرنے کے بعد اپنی رونلڈ کولمین ٹائپ کی مونچھوں کی داہنی نوک

کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا اور گنگناتا جاتا تھا :

وہ جھرو کے سے جو جھانکے تو میں اتنا پوچھوں
گھٹیاں لوگی ؟

"ارے پی چو تمہاری سسرال ـــ" یہ بلند پایہ روح کو نزڑ پا دینے والا شعر سن کر زخشندہ کو اتنی ہنسی آئی۔ کہ وہ اپنی اطلاع پوری نہ کر سکی۔

"کیا ہوا میری سسرال کو بھائی ؟" پی چو نے آئینے کی طرف سے مڑ کر اپنا نغمہ ادھورا چھوڑتے ہوئے پوچھا

"ارے تمہیں امیر پور ہاؤس بُرد کھوے کے لئے بلایا گیا ہے"۔

"ہزار بار تم سے کہا ہے کہ امیر پور شریف کا نام لینے سے پہلے وضو کیا کرو"۔

"ارے سنو تو۔ کل شام جو لالہ ممی کے سفیر خاص بن کر گئے تھے نو ـــ"

"پھر کیا ہوا اماں جلدی بتاؤ دیباچہ ختم کرو ـــ"

"ادفوہ تو تم ذرا شرماؤ تو سہی ۔ مار بیچ میں بولے جاتے ہو ـــ"

"شرما تو رہا ہوں بھائی ۔میں تو ہوں ہی اتنا سینٹی منٹل"۔ پی چو نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"بالکل تم سے زیادہ سینٹی منٹل بھلا کون ہو گا۔ چپو تو۔ لالہ جو یہ خط لائے ـــ"

"روشی واللہ تم نے کیا صبح صبح کدفت کا ذکر چھیڑ دیا"۔ پی چو نے پہلی بار سنجیدگی سے کہا اور پھر مونچھوں کی داہنی نوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کوفت ـــ!؟ میٹ ہیں جناب کے چہرے کو در رہے ہیں۔ اچھا کون سا سوٹ پہن کر جاؤ گے ۔میں بتاؤں ۔ وہ پہنو ـــ وہ والا جو ہے ـــ"

"میں جاؤں گا ہی نہیں"۔ پی چو نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا ہٹیئے مت آپ۔"

"پولو کو لے جاؤ میرے بجائے۔"

"باؤلے ہو گئے ہو تم۔ ممی تمہارے کان کھینچیں گی"۔

"کھینچنے دو۔ ذرا اور لمبے ہو جائیں گے تو زیادہ خوبصورت لگوں گا۔"

"غفران منزل میں قیامت اُٹھے گی۔ یہ سمجھ لو۔"

"میں قیامت اُٹھنے سے پہلے ہی اپنا تبادلہ پرتاپ گڑھ کا کروا لوں گا۔"

"پی چو بھئی واللہ انڑا ہٹ کی حد ہوتی ہے۔"

"اچھا اپنا لیکچر ختم کرو تو تمہیں یہ بتاؤں کہ ابھی کرسٹابل کا فون آیا تھا۔"

"اچھّا ۔۔ چھا۔" رخشندہ نے یکلخت رک کر کچھ سوچ کر کہا۔

"اور کرسٹابل نے کہا ہے کہ تمہارے اور پولو کے ہندوستان واپس آنے کے بعد آج وہ پہلا ڈنر دے رہی ہے۔ لہٰذا اس میں ہم سب کا شامل ہونا بہت ہی ضروری ہے"

"دوسرے الفاظ میں یہ کہ آپ آج رات امبر پور ہاؤس نہیں جا سکتے۔"

"ظاہر ہے۔"

"بے وقوف ہیں آپ بالکل۔"

"بے وقوف آپ خود ہیں۔"

وہ دریچے سے باہر باغ میں کود کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ایک قیامت صغریٰ تھی جو یکلخت بپا ہو گئی۔ ایک شور محشر تھا جو لگتا تھا کہ امبر پور ہاؤس

کے کلابتّو زردوزی والے پھاٹک سے لے کر عرشِ اعظم فلک کے کنگورے ہلا دیتا ہے
غفران منزل والیاں آ گئیں؟ — مہریاں بولائی پھر رہی تھیں۔ یہ سن کر اور زیادہ بدحواس
ہو گئیں۔ امیر پور کی بڑی بیگم غفران منزل والیوں کے اب تک نہ پہنچنے سے خاصی پریشان
تھیں۔ ساری مہمان بیبیاں جمع ہو چکی تھیں اور گاؤ تکیوں سے لگی پان اور زردے میں مشغول
تھیں جب حسینی خانم نے جو برابر کے کمرے میں تختوں کے چوکے پر فیرینی کے پیالے
ترتیب دے رہی تھیں۔ یہ سنا کہ سمدھیانے والیاں سچ مچ میں آن پہنچیں، خوان پوش
اٹھاتے اٹھاتے دہلیز پر انہیں دو دفعہ ٹھوکر لگی اور کئی اگالدان قریب قریب اُلٹ
گئے۔ تب کہیں جا کر غفران منزل کی پرانی اسٹوڈی بیکر آہستہ آہستہ امیر پور ہاؤس کی
سُرخ برساتی میں داخل ہو کر سیڑھیوں پر جھکے ہوئے پام کے پتوں سے آ لگی۔ بیگمات
ایک ایک کر کے پائنچے سنبھالے ہال میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے خاصدان
اٹھائے مہریوں کی قطار اور عباسی خانم تھیں۔ پھر سے لڑکیوں کے ہجوم میں مدھم سا
شور اُٹھا۔ رخشندہ بجیا آ گئیں۔ رخشندہ بجیا دبلی ہو گئیں۔ نہیں رخشندہ بجیا پہلے سے زیادہ
موٹی لگ رہی ہیں۔ رخشندہ بجیا کو سمندر کی ہوا نے زیادہ خوبصورت کر دیا۔

"واللہ چودھرائن تہری باٹ نہارت سویرا ہو گوا۔ ہم تو سوچت رہن
اتنی ابیر کرد ہین۔ اب تم نہ آئیہو" امیر پور کی بیگم نے کہا۔

"پی جی موٹر یا کلب لے گئے رہین یہی مارے اب لگ ناہیں آئے سکن"
مہاراج کی کنور رانی نے جواب دیا۔

پھر سب بیگمات باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ لڑکیاں اپنی ٹولی بنا کر الگ جا بیٹھیں
باہر مہریوں اور خواصوں کی گہما گہمی اور آنے والی بیگمات کے آداب و تسلیمات کا سلسلہ

ختم ہوا اور حالات نارمل ہوئے تو فرنگی محل کی ایک بیگم نے کنور رانی سے پوچھا۔

"اللہ سلطنت باجی اب آپ ماشاءاللہ سے رخشندہ بٹیا کا بیاہ کب کریں گی قسم سے ہم تو اسی انتظار میں پڑے دن گنتے ہیں کہ آپ کے ہاں سمدھن بن کر آویں" "پہلے پی چو پولو کے بیاہوں سے تو نپٹ لوں زبیدہ بیگم۔ کنور صاحب اپنی بٹیا کی فکر خود کریں گے۔ یہ انہیں کا کام ہے۔" کنور رانی بولیں۔ پی چو کا نام سنکر لڑکیوں نے اپنے کان کھڑے کئے۔

"اے ہے چودھرائن، کاہے نہیں دونوں کو ساتھ لیتی آئیں۔ مدتوں سے دیکھا ہی نہیں انہیں۔ جب مائٹیز میں انور کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تب کبھی کبھی آیا کرتے تھے" امبر پور کی بیگم کی دیورانی نے کہا۔

"رخشندہ نے صبح پی چو سے چلنے کے لئے کہا تو تھا۔ لیکن انہیں اپنے فلائنگ کلب اور گھوڑوں سے ہی فرصت نہیں جو کہیں آویں جاویں اور اب اتنے دنوں بعد پولو اور رخشندہ لکھنؤ واپس آتے ہیں تو دوست ایک پل کے لئے نہیں چھوڑتے" کنور رانی نے کہا۔

"اللہ تو ہمیں کیا دشمن سمجھ رکھا ہے جو دوستوں سے فرصت نہیں۔ قسم سے رخشندہ بیگم تم اور تمہارے بھائی بہت ہی بے مروت نکلے بڑے ہو کر" امبر پور راج کی چھوٹی بہو بیگم نے شکایت کی۔

"بھئی اچھا ہم ابھی پی چو کو فون کئے دیتے ہیں" رخشندہ نے کہا۔

"ہاں بٹیا ان سے کہدو کہ سب کھانے پر تم دونوں کی راہ دیکھتے ہیں۔ گھر ہی پر ہوں گے اس وقت؟"

"گھر؟ دلہن بھابی" اس وقت تو پی چو پولو عموماً دلکشا کلب میں پائے جاتے ہیں"۔ رخشندہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ فون کرنے کے لئے گیلری میں چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب لڑکیاں بھی باہر آگئیں۔

کچھ دیر بعد اس نے گیلری میں سے کہا۔ "پی چو کہتا ہے میں امبر پور ہاؤس آکر کیا کروں گا۔ جب میں وہاں پہنچتا ہوں۔ سب لوگ ایک دم سے پردہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں"۔

لڑکیوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ امبر پور راج کی جمیلہ سلطانہ جھپٹ کے اندر بھاگ گئی۔

"اے لڑکیو ہم بھی آویں؟" امبر پور راج کی چھوٹی بہو بیگم نے گیلری میں آکر ہنسی میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"اے لو لڑکیوں کی کانفرنس تو گیلری ہی میں شروع ہو گئی" کسی نے ہال میں آکر کہا

"ممی پی چو نے کہا ہے کہ میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکوں گا۔ کیونکہ ممی ہمیں ابھی کرسٹابل کے ہاں "لالہ رخ" بھی جانا ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد برساتی میں ایک اور کار زناٹے سے آکر رکی اور پی چو اور پولو امبر پور ہاؤس کے مردانہ ڈرائنگ روم میں دوسرے لوگوں کے پاس جا بیٹھے۔ لڑکیوں کے فرقے میں بڑی کھلبلی مچی۔ بیگمات نے بھی کھڑکیوں کے شیشے میں سے انہیں برآمدے گزرتے ہوئے ایک جھلک دیکھ لیا۔ پھر کھانا شروع ہوا اور ان او فیشیل طور پر ایک طریقے سے گویا بر و کھوا انجام پایا۔

"فوں — فوں" پی چو نے امبر پور ہاؤس کے پھاٹک سے نکل کر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کار کی رفتار ایک دم بہت تیز کر دی۔

"اچھا ہوا پی چو تم آ گئے۔ ورنہ ممی بہت بگڑ رہی تھیں"۔ رخشندہ نے کہا۔
پی چو خاموش رہا۔
"لالہ رخ میں زندگی کیسی چل رہی ہے"۔ رخشندہ نے تھوڑی دیر بعد کشن پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔
"بالکل فٹ۔ صرف حفیظ احمد کی ناک زکام کی وجہ سے لمبی ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے وہ بے حد انٹلکچوئیل لگنے لگا ہے"۔
"اور کون کون آ رہا ہے آج کرسٹابل کے ہاں"۔ رخشندہ کو حفیظ احمد کا یہ حلیہ سوچ کر ہنسی آ گئی۔
"تمہاری ہیڈ ہیبٹرز پارٹی آن لمیٹیڈ تو ساری تشریف لائے گی۔ صرف کرن نہیں ہوگا"۔ پولو نے کہا
"اے روشنی یہ امبر پور والوں کا بھتیجا آج نظر نہیں آیا"۔ پی چو نے یکلخت کہا۔
"کون بھتیجا"۔ رخشندہ کو امبر پور والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آج محض ایک ڈپلومیٹک مشن پر وہاں گئی تھی۔
"ڈوَن اوز دی گریٹ"۔ پی چو نے کہا۔
"وہ تو آج کل فیض آباد میں فلسفہ حیات پر ریسرچ کر رہا ہے"۔ پولو ہمیشہ ضروری معلومات بہم پہنچا کر پھر خاموش بیٹھ جاتا تھا اور پائپ پیتا رہتا تھا۔
کلائیڈ روڈ پر سے مڑ کر کارلٹن ہوٹل کے اونچے اونچے دیو دار کے درختوں کے سامنے سے گزرتے شاہ نجف روڈ پر وہ "لالہ رخ" کے پھاٹک میں داخل ہوگئے۔ آسمان پر گرمیوں کی رات کے دھیمے ستارے جھلملا رہے تھے اور فضا میں سکندر باغ

کے پھولوں کی مہک اڑنے لگی تھی۔

"ارے ہائے روشی ڈارلنگ تم آگئیں" سرخ بالوں والی کرسٹابل حفیظ احمد لالہ رخ کے برآمدے میں سے اتر کر لان کی طرف بھاگتی ہوئی آئی۔

"ارے ہائے پوٹو ڈارلنگ تم آگئے" سارنگ پور کے راجہ حفیظ احمد خان نے پی چو اور پوٹو کے قریب پہنچ کر لڑکیوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے انداز کی نقل کی سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اے معزز حاضرین! آج پی چو میاں سلمہ کا روکھوا بخیر وخوبی انجام پایا" رخشندہ نے کھانے کے بعد سب کو بتایا۔ زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔

پی چو ایک دم اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا" روشی اب گھر چلو" اس نے پھر جھنجھلا کر کہا

"یہ کیا وحشت ہے" حفیظ احمد نے پوچھا

"پولس میں رہ کر جنگلوں کی ہوا کھاتے کھاتے پی چو اب بالکل کاؤ بوائے ہوتا جارہا ہے" ڈائمنڈ نے کہا۔ وہ سب باغ کی سڑک پر آگئے۔ یکایک رخشندہ کو کوئی بڑی ضروری بات یاد آگئی۔ وہ حفیظ احمد کو کھینچتی ہوئی برساتی کی روشنی میں لے گئی۔

"ارے حفیظ بھیا۔ تمہاری ناک —"

سب اس کی ناک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"پی چو نے اطلاع دی تھی کہ ہماری عدم موجودگی میں تمہاری ناک بہت لمبی ہو گئی ہے لیکن یہ تو بالکل نارمل حالت ہے مجھے اتنی فکر ہو گئی تھی کہ اب کرسٹابل بچاری تمہاری پلاسٹک سرجری کہاں کرائی پھرے گی" سب شب بخیر کہنے کے لئے کرسٹابل کی طرف مڑے۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

کرسٹابل شاید نوکروں سے کچھ کہنے اندر گئی ہے۔ اچھا کھئی اب چلتے ہیں بہت دیر ہوگئی ہے۔ ممّی کی ڈانٹ پڑ جائے گی۔" رخشندہ نے کہا۔

سارے مہمان اپنی اپنی موٹروں میں جا بیٹھے۔

پی تی بہت پہلے سے کار کے اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

دوسری صبح رخشندہ کنور صاحب کے ساتھ جارج پی گراو پر سے اترنے کے بعد اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آج کے ملو بل اور اونگھتے دن میں اسے کون کون سے بیکار کام کرنے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ابھی بہت سی باقی تھیں اب تک نینی تال جانے کا پروگرام نہیں بنا تھا اور ہر نیا دن ایک ہی سا طلوع ہوتا تھا۔ اس نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ دنیا یقیناً بہت بشاش تھی۔ زندگی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ پھولوں کی کیاریوں میں پولو کے کتنے تتلیوں کے تعاقب میں مصروف تھے۔ بڑی سہانی صبح تھی۔ کچھ ایسا وقت تھا جس کی فضا سے متاثر ہو کر ایک بار براؤننگ نے لکھا تھا کہ دنیا میں ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اللہ میاں مزے سے اپنی جنت میں تشریف رکھتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی خوش ہے۔ دنیا سے اس کی مکمل صلح ہے۔ اس کا جی چاہا کہ خوب مزے کی باتیں کرے۔ سائیکل پر بنارسی باغ کی خاموش اور سایہ دار سڑکوں کے چکر لگائے۔ ڈائمنڈ گنی کرسٹابل ادما اور اپنی دوسری سہیلیوں کی پوری بریگیڈ کے ساتھ اسی وقت نیو انڈ باکافی ہاؤس پہنچ جائے اور وہاں اپنے پسندیدہ کونے میں کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر خوب چلا چلا کر باتیں کرے

اور قوالی گائیے غسل خانے میں چھپ کر پی چو کے سارے سگریٹ پی ڈالے۔ اپنے سب دوستوں کو فون پر یہ خبر سنائیے کہ فی الحال وہ غم دوراں اور غم جاناں کی ہر فکر سے آزاد ہے تب مولسری کی کلیوں کو باغ کی ٹھنڈی، نم زمین پر بکھیرتا پروائی ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرایا اور باغ کے شبنم آلود سفید شگوفوں کی تیز خوشبو اس کی چھوٹی سی میدونا کی ایسی ناک میں گھسی اور اسے پچھلی چاندنی رات کا وہ ادھورا دھندلا خواب یاد آیا اور اسے بڑی عجیب قسم کی تکلیف محسوس ہوئی اور وہ زندگی کی بھرپور مسرتوں پر زیادہ دیر تک خوش نہ رہ سکی۔

اسی وقت باہر پولو کا مختصر ترین کتا اپنی نازک آواز میں بھونکا۔ گویا گڈ مارننگ مائی ڈیئر ڈیئر پی چو، پولو کے سارے کتے انگریزی میں بھونکتے تھے اور دوسرے لمحے کھڑکی میں سے کود کر پی چو اندر آ گیا۔ پی چو اور رخشندہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کمروں میں کھڑکی کے راستے داخل ہوا کرتے تھے۔

اس نے دیکھا کہ رخشندہ بڑی رنجیدہ شکل بنائے ناخنوں پر کیوٹکس کا بادامی قشیڈ لگانے میں مصروف ہے۔ وہ بھی اتنی ہی رنجیدہ شکل بنا کر اس کے قریب دریچے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

"پی چو تم تو خبطی ہوتے جاتے ہو بھوتنے سے۔" رخشندہ نے بڑی فکرمندی کے لہجہ میں ناخنوں کو روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اور یکا یک پی چو کی ساری شگفتگی واپس آ گئی۔ حالانکہ رات "لالہ رخ" سے واپس آنے کے بعد سے اب تک وہ اپنے کمرے میں بھولے بلے کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا تھا اور صبح کو کنور صاحب کے ساتھ چاء پینے کے لئے ادھر بھی نہیں گیا تھا۔

"کہت کبیر سنو بھئی سادھو۔" اُس نے بات شروع کی۔

"فرماؤ۔" رخشندہ نے رنگوں کی شیشیاں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم یہ اپنا منہ کیوں تھتھلائے بیٹھی ہو۔"

"تم بات تو بتاؤ۔ کوئی پروگرام ہے؟"

"پروگرام نہیں تو میں اپنے کمرے سے اتنی دور چل کر محض آپ کے روئے پر نور کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔"

"تو کہو تو سہی۔"

"پہلے تم تیار ہو جاؤ جھٹ پٹ۔"

رخشندہ نے کھڑکی سے نیچے اترنے میں ذرا کاہلی کی۔

"اسے بھئی کرن انڈونیشیا سے واپس آگیا ہے اور لونجے دلی سے یہاں پہنچ رہا ہے۔"

"کرن آگیا؟ ۔ افوہ۔ گنی کو پتہ ہے؟" رخشندہ فوراً کود کر نیچے اتر آئی۔

"گنی کو کیسے معلوم ہوتا۔ رات ہی تو وہ کرسٹابل کے ہاں آئی تھی۔ کرن کا تار تو مجھے ابھی ملا ہے۔"

"ارے تو پھر اسے بتانے چلیں یہاں سے سیدھے امو سی نھوڑی جائیں گے۔ راستے میں گنی ڈائمنڈ فیروز سب کو لیتے چلیں گے۔"

"گویا پوری استقبالیہ کمیٹی امو سی پہنچے گی۔ کرن کو اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ چین اور انڈونیشیا ہو آنے سے وہ یکایک کتنی اہم ہستی بن گیا ہے۔"

وہ غسلخانے میں پہنچ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد پی چو اور رخشندہ غفران منزل کے پھاٹک سے نکل کر پھر مال پر آ گئے

اتوار کی صبح تھی۔ اس لئے حضرت گنج کی ساری دوکانیں بند تھیں۔ لیکن دونوں قہوہ خانوں کے آگے بہت چہل پہل تھی۔ بادل گھر آئے تھے اور موسم میں کچھ کچھ ٹھنڈک آچلی تھی۔

ایبٹ روڈ کے چوراہے پر پہنچ کر رخشندہ نے کہا۔ "پی چو نیشو دھراموسی سے کہتے چلو کہ گنی کو ہمارے ساتھ اموسی بھیجدیں"۔

"کیا نیشو دھراموسی کے ذریعے مجھے پٹواؤ گی"۔

"تو ہم یہ تھوڑی بتائیں گے کہ کرن کو لینے جا رہے ہیں"۔

"جی نہیں"۔

وہ چپ ہو گئی۔ وہ لورٹیو کانونٹ کے آگے سے گذر رہے تھے۔ اسی وقت دلکشا کی طرف سے آتی ہوئی ایک نیلے رنگ کی ٹوسیٹر زن سے ان کے قریب سے نکل گئی۔

"آ گیا ڈون اُور ـــــ" پی چو بولا۔

"دی گریٹ" پوٹو نے مصرع طرح مکمل کر دیا۔

"تم دونوں اس قدر کے اینچی ہو خدا کی قسم"۔ رخشندہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ارے بھائی طبیعت گلیڈ ہو رہی ہے۔ ذرا سوچو کرن سے اتنے دنوں بعد ملیں گے" پی چو نے کہا۔

ایروڈروم پر تھوڑی دیر کے لئے جنگل میں منگل ایسا ہو گیا تھا۔ میدان کی اونچی گھاس میں بہت سی موٹریں اور اسٹیشن ویگن کھڑے تھے۔ وہ تینوں آم کے جھنڈ میں کار کھڑی کرکے فلائینگ کلب کے برآمدے میں جا بیٹھے۔ ان کے بہت سے جاننے والے جو

اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لینے یا پہنچانے آئے تھے، ان کے پاس آگئے۔
کچھ دیر بعد بھارت ایر ویز کا ایک طیارہ آسمان پر سے اترا اور گہری کھوئی کھوئی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والا ایک کشمیری نوجوان اٹیچی کیس سنبھالے اپنی متجسس نگاہوں سے اپنے دوستوں کو تلاش کرتا مجمع سے باہر آیا۔
"ارے ہائے کرن بھیا۔" رخشندہ، پی چو اور پولو اس کی طرف دوڑے اور اسے اپنے بازوؤں میں گھیر کر کار کی جانب آگئے۔ سوالات اور جوابات جلدی میں سب آپس میں گڈمڈ ہوگئے۔
"چنانچہ یہ یوں ہے" کار میں بیٹھتے ہوئے کرن نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔
"اور بتاؤ۔ لکھنؤ کے کیا حال چال ہیں" اس نے پوچھا۔
"سب بالکل کنٹرول ہے کرن بھیا" رخشندہ نے ہنس کر کہا۔
"لوگ باگ مزے میں ہیں؟" کرن نے پوچھا
"بالکل۔ بڑا افسوس ہے کہ لوگ باگ اس وقت نہ آسکے۔ میں نے تو کہا تھا پی چو سے" رخشندہ نے جواب دیا۔
کار امو سی سے لکھنؤ کی طرف کانپور روڈ کے سایہ دار راستے پر بڑی آرام دہ رفتار سے آرہی تھی۔
"روشی تم تو اب بہت ہی بڑھیا ڈرائیو کرنے لگی ہو" کرن نے کہا۔
"تسلیم"
"اور کچھ نئی خبریں سناؤ۔ تم لوگ آج کل کاہے میں مصروف ہو؟"
"ہم لوگ؟ مقامی سیاست میں"

"مقامی سیاست؟"

"ہم نہیں پتہ نہیں دلّی سے ایک لیڈرانِ قوم آئے ہیں۔ انھوں نے اپنا اسٹڈی سرکل قائم کیا ہے۔ کل یہاں سے نکلنے بھی تشریف لائے تھے کہ انھیں کچھ عطیے سے نوازا جائے۔"

"یہ اسٹڈی سرکل کاہے کے لئے ہے؟"

"یہاں کی ملّت بیضا میں قومی جوش پیدا کرنے کے لئے۔ کیونکہ ہماری قوم کو اکثریت سے پس جانے کا سخت اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"ان لیڈرانِ قوم کا نام کیا ہے؟"

"سید افتخار علی اور میں نے ان سے کہا۔ آپ اپنے یہ ایڈوینچر کسی اور جگہ کے لئے اٹھا رکھئے تو وہ کہنے لگے کہ آپ کی پارٹی اور آپ کا رسالہ شیشے کے گھروں میں محفوظ ہے۔ آپ کی زمینیں اور آپ کی زندگیاں صرف ہمارے رحم و کرم پر منحصر ہیں۔ کیونکہ الحمدللہ ملّت اب ہماری آواز پر لبّیک کہنے کو تیار رہے اور انھوں نے نیوایرا کے مقابلے میں ایک اردو رسالہ "ملّتِ بیضا" بھی جاری کیا ہے۔" پھر وہ چپ ہو گئی۔ کرن بھی خاموش رہا۔

"سنا ہے تمہارے ہندوستان واپس آنے کے سفر میں پچھلے مہینے بڑے ایڈونچرز رہے۔" کچھ دیر بعد کرن نے موضوع تبدیل کرنے کے لئے پوچھا۔

"بہت ــــ" رخشندہ نے جواب دیا اور کار کی رفتار اس سے ایک دم بہت تیز ہو گئی۔

تھوڑے وقفے کے بعد مورتی سے واپس آنے والی موٹر بن گرد

اڑاتی ان کے برابر سے نکل جاتی تھیں اور پھر خاموشی پھیل جاتی تھی۔ ان چاروں کا جی چاہ رہا تھا کہ بہت سی باتیں کریں۔ لیکن اتنی ڈھیروں باتیں تھیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کی جائیں۔

اپنے جھولتے ہوئے صوفے پر سے اتر کر کنور صاحب نے قانون شیخ بند کی اور لالہ اقبال نرائن کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ لالہ اقبال نرائن نچلی منزل کے دفتر کے کمرے میں صبح سے ریاستی معاملات کے کاغذوں پر جھکے رہنے کے بعد اپنے منشیوں کو چند ہدایتیں دے کر اندر تشریف لے جا چکے تھے۔ جہاں کنور رانی اپنی صحنچی میں خس کی ٹٹیوں کے پیچھے بیٹھی ان سے مشورہ لیتی تھیں کہ پی چو بھیا کی نسبت اگلے چاند امیر پور والوں کے ہاں کردی جائے یا ابھی آئندہ ربیع الاول کا انتظار کیا جاوے۔ لالہ مونڈھے پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھنے اور زردہ پھانکنے کے بعد اپنی رائے سے کنور رانی کو مطلع کرنے ہی والے تھے کہ اپنا پڑلقے کی اودی گوٹ کا لہنگا گھماتی شعلہ تیزی برآمدے میں آکر بولی "لالہ تم کا میاں بلاوت ہیں"۔

"بہت خوب۔ ان سے عرض کرو کہ ابھی حاضر ہوا"۔ لالہ پھر زیر غور مسئلے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

نشست کے ایوان میں گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ بچے ابھی کار لے کر نہ لوٹے تھے اور کنور صاحب کو فیض آباد جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اسٹیشن ویگن خراب ہو کر کئی دن سے ایلیو برمی کے ہاں پڑی تھی اور ریل کے سفر کے گرمیوں کے موسم میں کنور صاحب قائل نہ تھے۔ خاصے کے وقت میں بھی ابھی بہت دیر تھی۔ کنور صاحب

نے لالہ اقبال نرائن کے انتظار میں پھر کتاب اٹھالی ۔ انہیں معلوم تھا کہ لالہ اس وقت کنور رانی کی پیشی میں ہیں ۔ بہت دیر میں وہاں سے چھٹکارا پاسکیں گے ۔

نیچے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ اندر ہال میں سجے ہوئے سنگ مرمر اور تانبے کے مجسّموں اور پرانی روغنی تصویروں کے نقوش دوپہر کے اندھیرے میں زیادہ گہرے، زیادہ پراسرار نظر آرہے تھے ۔ فضا پر وہ خواب آگیں سناٹا چھاتا جا رہا تھا جو گرمیوں کی بھرپور دوپہروں میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں سما کر دھیرے دھیرے دھڑکتا رہتا ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر دنیا یہی ہے تو بری نہیں ۔

کنور صاحب نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پیچوان گڑگڑانے میں مصروف ہو گئے ۔ وہ شیشوں سے بنے ہوئے اس رنگ محل میں اسی طرح بیٹھے قانون شیخ پڑھتے اور چاندی کا پیچوان گڑگڑاتے رہتے تھے جو ان کے بزرگ صدیاں گذریں ان کے لئے تیار کر گئے تھے ۔ وہ بلاوجہ اس جگہ پر تھے ۔ جہاں آنکھ کھول کر انہوں نے خود کو موجود پایا ۔ گومتی کا جانے کتنا پانی چھتر منزل کی سیڑھیوں کے نیچے سے بہہ گیا تھا لیکن کہواہا راج والوں کی زندگیوں میں کوئی فرق کوئی انقلاب نہ آیا تھا ۔ کنور صاحب سال کا زیادہ حصہ اپنی ریاست کے قصبے مانا ٹھیر میں گذارتے ۔ جاڑوں میں لکھنؤ آجاتے گرمیوں میں وائلڈ فلاور ہال نینی تال یا سوائے ہوٹل مسوری کو زینت بخشتے ۔ ان کے مشغلے تعداد میں بہت کم تھے ۔ سال میں چند مرتبہ قیصر باغ کی بارہ دری کے اعلی پیمانے کے مشاعروں کی صدارت، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر، گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم اور یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ جس کے وہ ممبر تھے ۔ کیونکہ اودھ کے دوسرے تعلقداروں کی طرح ان کے والد بڑے کنور صاحب مرحوم نے بھی کیننگ کالج

کی سر بفلک اور شاہانہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے گرانقدر عطیے دیئے تھے اور اس کا ذکر یونیورسٹی کے بینیٹ ہال کے پورچ میں ایک سنگ مرمر کے ٹکڑے پر مرقوم بھی تھا اور بینیٹ ہال کی اونچی، شاہ بلوط کی لکڑی سے مزین دیواروں پر صوبے کے سابق گورنروں اور دوسرے مہاراجاؤں اور نوابوں کی تصاویر کے ساتھ بڑے کنور صاحب مرحوم کی قد آدم روغنی تصویر بھی موجود تھی اور اس بینیٹ ہال اور اس یونیورسٹی میں جس کا ذرّہ ذرّہ ان کے بزرگوں کے روپے کا مرہون منت تھا۔ ایک احسان فراموش نسل مسلسل جاگیردارانہ نظام کے خلاف نعرے لگاتی تھی اور تجویزیں پاس کرتی تھی۔ کنور صاحب خاموشی سے یہ سب دیکھتے تھے اور قانون شیخ اور مولانا روم کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اور شام کو انڈین سول سروس کے معمر انگریز افسروں کے ساتھ شطرنج کھیلنے چھتر منزل کلب چلے جاتے تھے۔ وہ ایک پرسکون نظام زندگی کا بے ضرر سا پرزہ تھے ان کی ذات سے نقصان کسی کو نہ تھا۔ فائدہ ہزاروں کو تھا۔ ان کے چند خاص اصول تھے۔ خاص عقیدے اور نظریئے تھے۔ روایات وضعداری اور آن کا تحفظ ان کے نزدیک ان کا عزیز ترین فریضہ تھا۔ انہیں چند چیزوں سے بے پناہ نفرت تھی مثلاً وہ ان حقیر نو دولتیوں کا ناقابل معافی وجود کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے جنہیں اب تکلفاً اپر یا متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ انہیں متوسط طبقے سے چڑ تھی۔ اس طبقے نے ہر ملک میں ہر جگہ، ہر زمانے میں بڑی گڑبڑ پھیلائی ہے۔ بڑی بڑی گستاخانہ جرأتیں کی ہیں۔ اس لڑنی جھگڑنی، خود غرض، کاروباری بورژوا دنیا میں سب سے الگ تھلگ صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب، پرانی روایات کے ورثے کو لئے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف ہوائیں بہت تیز ہیں۔ کہاں کی

تہذیب اور کہاں کی وضعداری۔ یہ چراغ جو دو قوموں کے ثقافتی سنگم، تمدنی ہم آہنگی نے صدیوں سے روشن کر رکھا ہے۔ کوئی دم میں بجھا چاہتا ہے۔ لیکن اس چراغ کی مدھم روشنی نے ان رنگ محلوں میں جو دھندلا سا اُجالا بکھیر رکھا تھا وہی بہت بڑا جذباتی سہارا تھا اور اسی لئے چند سال قبل جب پی چو نے جو ریاست کا چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے محض گذارے دار تھا۔ دفع الوقتی کے خیال سے نوکری کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ تو کنور صاحب بہت بگڑے تھے۔ تاریخ میں آج تک ان کے خاندان میں کسی نے بھی انگریزی سرکار کی ملازمت نہیں کی تھی۔ ان کے بزرگوں نے اودھ کی سلطنت کے دم توڑنے کے زمانے میں نواب کی طرف سے کمپنی بہادر سے ٹکر لی تھی۔ جنرل ہیولاک کی توپوں کا سامنا کیا تھا۔ مٹیا برج میں قید فرنگ کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ مانا کھیڑی بیر کرو اہا راج کی حویلی کے تہ خانوں میں اب تک غدر کے وقتوں کے میگزین کا گولہ بارود دفن پڑا تھا اور اُن کا بیٹا اسی انگریزی سرکار کی غلامی کرے۔ یہ ناممکن تھا۔ ان دنوں جنگ نئی نئی چھڑی تھی۔ پی چو نے چپکے سے ایر فورس میں درخواست بھیج دی۔ پھر الہ آباد جا کر انڈین پولیس کے مقابلے میں بیٹھ گیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ کنور صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ لیکن برابر کی اولاد تھی اور چہیتا بیٹا تھا۔ چپ ہو گئے۔ مراد آباد کی ٹریننگ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ عرصے تک اضلاع میں رہا اور پچھلے سال بھر سے خوش قسمتی سے لکھنؤ ہی کی ملٹری پولیس میں اس کا تقرر ہو گیا تھا۔ پی چو ایک قسم کا چھوٹا موٹا پرنس آف ویلز تھا۔ خاموش طبیعت، سنجیدہ، کم سخن، اس کی ساری دلچسپیاں فلائنگ کلب اور کتوں تک محدود تھیں۔ اس کی نسبت لڑکپن ہی میں بڑی دھوم دھام سے اس کے ماموں کے ہاں کر دی گئی تھی۔ اور اس کے

بعد سے اس نے اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ پی تجو البتہ کنور صاحب اور کنور رانی دونوں کے لئے "پروبلم چائلڈ" ثابت ہوا تھا۔

کنور صاحب ایک حد تک بڑے وسیع النظر تھے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں سارا یورپ گھوم چکے تھے۔ ایک زمانہ کے سرد و گرم سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنے تینوں بچوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ ان میں خود اعتمادی، وسیع النظری اور عقیدے کی پختگی پیدا ہو سکے۔ انہوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی۔ اس نے میرس کالج میں پانچ سال کا کورس ختم کر کے بیچلر آف میوزک کی ڈگری لی تھی۔ اس نے الموڑے کے کلچر سنٹر میں رقص سیکھا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ دلکشا کلب جا کر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی تھی۔ وہ پی جو کی کار یا اپنی سائیکل پر جب چاہتی اور جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ اس کے ان گنت دوست تھے اور وہ سوسائٹی میں بے حد ہر دلعزیز تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسی زندگی نہیں گذارتی تھی جس طرح کی زندگی "خوش قسمت اونچے طبقے" کی عورتیں گرمیوں میں مسوری اور جاڑوں میں بمبئی یا نئی دہلی میں بسر کرتی نظر آتی ہیں۔ کنور صاحب زندگی کے ہر شعبے میں جس ضبط و توازن، وضعداری کی جس آن کے قائل تھے۔ اس کا اثر رخشندہ نے فطرتاً اس لئے کہ وہ عورت تھی سب سے زیادہ قبول کیا تھا۔

لیکن کنور رانی اور رخشندہ کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بچپن سے نینی تال کے اسکول کے بورڈنگ میں رہنے کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ مانوس نہیں تھی۔ جب سینئر کیمبرج کے بعد وہ گھر واپس آئی تو اس نے غیر محسوس طریقے سے

خود کو کنور رانی سے بہت زیادہ اجنبی پایا۔ کنور رانی اپنے بیٹوں کو زیادہ چاہتی تھیں جس کا لازمی نفسیاتی ردِ عمل یہ تھا کہ کنور صاحب رخشندہ کو دیکھ کر جیتے تھے۔ کنور رانی کی طبیعت بہت مختلف تھی۔ وہ بے تحاشا اونچے حسب نسب والی، مغرور، خود پسند سرتاپا کنور رانی ہی کنور رانی تھیں۔ مانا ٹھیر میں اور زعفران منزل میں محض ان کا حکم چلتا تھا۔ کنور صاحب کرو آبا راج کے صرف اس حد تک مالک تھے کہ لالہ اقبال نرائن جب فیض آباد سے آئین توان سے زمینداری کے جھگڑوں کے متعلق دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر لیں۔ ریاست کا کوئی ادق معاملہ آن پڑتا تو کنور رانی بڑے دلکش انداز سے سر ہلا کر کہتیں ــ" ای کا جانت ہیں۔ لے بس اب رہبے دیو۔" اور کنور صاحب وہیں معاملے سے دست بردار ہو کر اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے آتے۔ کنور رانی اب کوئی تینتالیس چوالیس برس کی رہی ہوں گی۔ لیکن اب تک غضب کی دلکش تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رخشندہ نواں کے پاسنگ بھی نہیں۔ اب بھی وہ جہاں بیٹھ جاتی تھیں محفل جگمگا اُٹھتی تھی۔ خاص خاص لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ کنور صاحب سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ لیکن کنور صاحب خاموش طبیعت اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ اس لئے گذرے جاتی تھی۔

یوں اس گھرانے کی زندگی ایک نرم رو ندی کے مانند تھی جو سکون سے بہہ رہی تھی اس میں تیز دھارے اور بھنور نہیں تھے۔ طوفانوں اور آندھیوں کا خطرہ نہ تھا۔ زعفران منزل کے باغ کی ڈھلوان سے پرے شاہ نجف کے امام باڑے کی سبز جھیوں کے نیچے جس طرح گومتی صدیوں سے اسی آہستہ خرامی سے بہتی آ رہی تھی۔ اسی طرح زعفران منزل کے باسیوں کی زندگی گذرے جاتی تھی۔ مولسری کے جھنڈ کے پیچھے

سے سورج ایک ہی طرح کے دنوں پہ طلوع ہوتا تھا۔

چنانچہ رخشندہ نے امو یمی سے واپسی پر کرن سے کہا "سب بالکل ٹھیک ہے کرن بھیا"
اور کرن بھی خوش ہو گیا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ عفران منزل کے بہن بھائی جہاں جاتے
اپنے ساتھ آفتاب کی خوشگوار کرنیں بکھیرتے جاتے ہیں اور گھنگھریالے بالوں والا
کرن بہادر کا ٹجو خود کو ان پیارے اچھے دوستوں کے درمیان ایک بار پھر موجود پا کر
کچھ دیر کے لئے اپنے سارے رنج بھول گیا۔ اسے یاد نہ رہا کہ اتنے مہینوں تک اپنے
صحافتی مشن پر چین اور انڈونیشیا رہ کر وہاں کی خونریزیاں دیکھتے دیکھتے وہ زندگی سے
کتنی نفرت کرنے لگا تھا۔ اسے اس کا خیال بھی نہ رہا کہ کرشن نرائن کول آئی سی
ایس کی اکلوتی بھوری آنکھوں والی لڑکی گیتی ہے جسے وہ مستقل ساڑھے تین سال
سے برابر اور بیکار چاہے جا رہا ہے۔ اس کی کسی طرح بھی شادی نہیں ہو سکتی۔
وہ چاروں عفران منزل کے باغ کی سایہ دار، سرخ بجری والی سڑک پر پہنچ
گئے۔ پی چو کے سٹنگ روم میں ڈائمنڈ اور اوما اور وٹل پہلے سے آ چکے تھے۔
اتوار کا دن تھا اور سب پر چھٹی منانے کی موڈ سوار تھی۔
"ارے بھائی یہاں تو پوری پنچایت جمع ہے۔" رخشندہ نے خوش خوش
برآمدے میں پہنچتے ہوئے کہا۔
"ارے کرن بھیا"۔ سب اپنی اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔
"اوہ بھئی کرن۔ اب ہم اترائیں گے۔" پی چو نے کہا۔
"کرن بھیا سنو تو ___" ڈائمنڈ نے بات شروع کرنی چاہی۔

"ٹھہرو۔ کرن بھائی اب صرف انٹرویو دیا کریں گے۔ پائنیر میں چھپے گا۔ کل شام
کرن بہادر گانچو نے کارلٹن ہوٹل میں پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا:۔
"کہ چونکہ مجھ سے زیادہ چغد آدمی گورنمنٹ آف انڈیا کو انڈونیشیا بھیجنے کے لئے
نہ مل سکا۔ اس لئے ـــــ" پی چو نے رخشندہ کا جملہ مکمل کر دینا چاہا۔ لیکن قہقہوں
کا شور سب پر غالب آگیا۔
"ڈائمنڈ ہمارے پیچھے لکھنؤ میں کیا کیا سانحے گذرے۔ سب مفصّل بیان فرماؤ"۔
کرن نے دیوان پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
ڈائمنڈ نے جو اسکنڈلز کی انسائیکلوپیڈیا اور ہُوازہُو کی تازہ ترین جلد تھی
اپنی رپورٹ شروع کی۔ قہقہوں کے شور سے کمرہ گونج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد
گل شبّو نے اندر آکر کہا۔ "بھیّا بٹیا۔ سب لوگ چلئے کھانا ٹھنڈا ہوتا ہے۔" وہ
سب ڈائننگ روم کی طرف چلے گئے۔
دوپہر کا خوشگوار سناٹا گہرا ہوتا گیا۔

غفران منزل میں اتوار کی سہ پہریں اور چھٹی کے دن اسی طرح گذرا کرتے تھے۔ ان سب کو
غفران منزل سے بڑی محبت تھی۔ اس کے آرام دہ اندھیرے کمروں سے، اس کے
خوبصورت باغ سے، اس کی بیحد گھریلو فضا سے، اس کے ہرے درختوں کے سائے
میں انہوں نے ایسی کتنی ہی دوپہریں اکٹھی گذاری تھیں۔ وہ جاڑوں میں لان پر سن شیڈز
کے نیچے بیٹھ کر نیو ایرا کے لئے اڈیٹوریل اور مضمون لکھتے۔ وہ آل ریڈیو پر جو انگریزی ڈرامے
پروڈیوس کرنے والا ہوتا اس کی ریہرسلیں وہیں لان پر کی جاتیں۔ وہاں سب جمع

ہوجاتے۔ ڈاکٹر مِٹّا، گنّی، کرسٹابل، فیروز سب بحثیں کرتے۔ ریڈیو ڈرامے کی
ٹکنیک پر ہر ایک اپنی اپنی ٹانگ اڑاتا۔ کرن کی انگریزی نظموں پر تنقید کی جاتی۔
وہ سب موسیقی کے دیوانے تھے۔ ان کی میوزک پارٹیاں پہروں ختم نہ ہوتیں۔ دونوں
نے عفران منزل کا نام جنرل ہیڈ کوارٹرز رکھ چھوڑا تھا۔ ان سب کو ایک دوسرے
کی رفاقت پُرخلوص کے جذبے پر بھروسہ تھا۔ اور یہ بھروسہ، یہ یقین بہت سی زندگیوں
کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ سب ذہین، بشاش طبیعتوں کے مالک تھے۔
وہ زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لڑکیاں چاکلیٹ کھاتے کھاتے فلسفۂ حیات
پر لمبی لمبی بحثیں کرتیں۔ "تم جنگلی خرگوشینو زیادہ باتیں نہ بناؤ۔" کرن کہتا۔ "جو
پہلا گنجا موٹا بے ڈھنگا کنوارا آئی سی ایس تمہیں آج ہی شام کو کلب میں ٹکرائے گا۔
اس سے شادی کر کے ہندوستان کے کسی اور دلکشا یا چھتر منزل کلب کی برج
کھیلنے والی اور ڈنر پارٹیاں دینے والی تیسرے درجے کے ذہن کی مکمل میزبان
مسز فلاں بن کر رہ جاؤ گی۔ دیکھ لینا کوئی دن جاتا ہے کہ تمہارے سارے ارادوں کا
کسی آئی سی ایس کے ڈرائینگ روم میں خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔" "کرن تمہاری
اس ساری cynicism کی سائیکولوجی یہ ہے کہ۔۔۔" خورشیدہ ایک اور بحث
شروع کر دیتی۔ یا فیروز گاندھی بیچ میں اپنا ایک لطیفہ لڑھکا دیتا۔ فیروز کے لطیفے
بہت مزیدار ہوتے تھے۔ اکثر پی چی میٹھے میٹھے تجویز کرتا کہ تم لڑکیاں ذرا بہت سارا
ناشتہ تیار کر کے بارہ بنکی چلو، دو جھٹ پٹ۔ آم کے باغوں میں سفیدے کے [illegible]
لکھنؤ سے باہر نکل کر بارہ بنکی جانے والی سایہ دار سڑک پر خورشیدہ یا گنّی اپنی مرضی کے
مطابق نہایت تیز رفتار سے کار چھوڑ دیتی تو پی چی بے حد سنجیدگی سے [illegible] کی

لائف انشورنس کمپنیوں کے پتنے نوٹ کرتا رہتا۔ ڈنر کے بعد پارٹیاں اگر ڈل ہونے لگتیں تو پی چو بڑے کمال سے موقعے کو سنبھال لیتا۔ اگر کبھی با کرن کی موڈ خراب ہو جاتی تو وہ ایسے مزے مزے کی باتیں کرتا کہ سب بے اختیار ہنس پڑتے۔

چھٹیوں کی ایک سہ پہر کو رخشندہ اور ڈائمنڈ نے انکشاف کیا کہ "ہمیں نہ بھریں شکوے نہ گئے' والی قوالی کے ریکارڈ پر بہترین والز ہو سکتا ہے۔ رخشندہ بھاگی بھاگی گئی اور پی چو اور کرن کو باہر سے بلا لائی۔ جہاں وہ بڑی سنجیدگی سے کسی مسئلے پر جھگڑ رہے تھے۔" پی چو اب تم ہمارا ڈانسٹریشن ڈانس دیکھو"۔ رخشندہ اور ڈائمنڈ کمرے کا قالین ایک طرف ہٹا کر ریکارڈ پر والز کرنے لگیں۔ پی چو ہنستے ہنستے لوٹ گیا" مانتے ہیں سلیمان۔ تم لوگ درسٹائل ۔۔۔ کیا کرن؟

"ورسٹائل جینئس"۔۔ کرن نے مدد کی "حق ہے"۔ پی چو کہتا "اچھا اب" علی بابا" بجاؤ" یہ پی چو کا ایک پسندیدہ باڈلا سا رمبا کا ریکارڈ تھا۔ اس کا نام بہت دلچسپ تھا" رمبا مسلمانا"۔ اس میں ایک عورت انتہائی باریک آواز میں کارمن میرانڈا کے گانوں کی طرح کا ایک عجیب سا گیت جانے کون سی زبان میں گاتی تھی اور کرن کہتا تھا۔ بھئی یہ کیا قصہ ہے۔ نینی تال کے اسکول اور الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں سپر انٹلکچوئیل سے کم کچھ پروڈیوس ہی نہیں کرتیں۔ ہماری بہنوں کو دیکھ لیجیے۔ خدا کی عنایت سے سب کی سب ایک سے ایک ورسٹائل جینئس چلی آ رہی ہیں۔ سب خوب ہنستے۔

جاڑے کی راتوں میں جب رودلی، سندیلے اور فیض آباد سے رشتے دار لڑکیاں آ جاتیں تو اندر صحنچیوں میں گھنٹوں ڈھولک پٹتی۔ عباسی خانم سے پرانے قصے اور داستانیں سنی جاتیں۔ پھر برسات کا زمانہ آتا۔ باغ بر گھٹا جھکی کھڑی ہے۔ برآمدے میں

آموں کی کھانچیاں رکھی ہیں۔ جامن میں جھولا پڑا ہے۔ جامنیں ٹپ ٹپ گرتی جاتی ہیں۔ لڑکیاں تانیں اڑا رہی ہیں۔ ساون اور بارہ ماسے اور کجریاں الاپی جارہی ہیں ساون جھڑ لاگے ہو دھیرے دھیرے ۔۔ اور ۔۔ اونچی اٹریا بچھا بچھا باجے ۔ رم جھوم بدروا برسے ۔۔ برکھا کے مہینوں میں باغ کے پتے پتے پر نکھار آجاتا تھا اور فضا میں مہک امنڈتی تھی۔ عفران منزل کا خاصا بڑا باغ تھا اور رنگ برنگے شیشوں والے دروازوں اور کھڑکیوں کے بڑے بڑے اندھیرے کمرے تھے۔ جن کی دیواروں پر منقش فریموں والے قدِ آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں نے گزرتے ہوئے وقت کی جانے کتنی پرچھائیاں دیکھی تھیں اور چھت گیریوں سے جھاڑ فانوس ٹنگے تھے۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں ڈیوڑھی سے اندر جا کر ایک اور باغ تھا۔ جس میں زیادہ تر لیموں، مولسری، انار اور فالسے کے پیڑ تھے اور بیچ میں ایک لمبی اور پتلی نہر تھی جس کی منڈیر پر بیٹھ کر مہرباں خوش گپیاں کیا کرتی تھیں۔ اوپر کی منزل پر منقش، جالی دار شہ نشین تھے اور گیلریاں تھیں اور لکڑی کے زینے تھے۔ جن پر بچھے ہوئے قالین اب بالکل گھس چکے تھے۔

عفران منزل اگلے وقتوں کی کوٹھی تھی۔ آج کل کے مکانوں میں ایسا آرام ایسی کشادگی اور خوبصورتی کہاں۔ اب تو سب بولا کر سیمنٹ کے ایسے ایسے بے تکے گھر بنانے لگے ہیں جیسے جیومیٹری کی شکلیں آڑی۔ ترچھی، کانی، بے ہنگم۔ رخشندہ ہر پرانی بات کی طرح اپنا یہ پرانا گھر بہت پسند تھا۔ اسے خوشی تھی کہ کنور صاحب نے فیشن میں آکر چھاؤنی یا لالہ زار میں اپ اسٹارٹس جیسی سیمنٹ کی کوٹھی نہیں بنوا ڈالی۔ نینے ہاں کا پرانی وضع کا بھاری آبنوسی فرنیچر پسند تھا اور پرانے جھاڑ فانوس۔ ان رنگ برنگے جھاڑ فانوسوں پر عموماً گرد اٹی رہتی تھی۔ کیونکہ عفران منزل میں نہ تو اتنے فالتو اور مستعد

ذکر تھے جو غدر کے وقتوں کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی میں اپنا سر کھپائیں اور نہ کسی کو اسکی پروا تھی۔ یہی کافی تھا کہ ٹنگے تو ہیں۔ پرانے اچھے وقتوں کی یادگار۔ وہ پرانے اچھے وقت جب اتنی کم عمری میں نہ غم روزگار سے سابقہ پڑتا تھا نہ غمِ دل سے۔

ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے جو گذر گئے۔ عباسی خانم کہا کرتیں جب غفران منزل غفران منزل تھی کہ رات کا وقت ہے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ بیلا پھول رہا ہے رات کی رانی پڑی مہک رہی ہے۔ بڑے کنور صاحب خلد آشیانی مہتابی پر بیٹھے پیچوان گڑگڑاتے ہیں محفل جمی ہے۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی ہیں کہ اتنے میں پھاٹک پر گھوڑا گاڑی آ کر رکتی ہے اور ٹوپ لگائے ایک صاحب بہادر اترتے ہیں۔ انہیں قریب آتا دیکھ کر کنور صاحب خلد آشیانی آرام کرسی پر لیٹے لیٹے ہاتھ پھیلا کر فرماتے ہیں ارے واللہ بھائی ملکو میاں اتنے دنوں بعد یہ کیا جی میں آئی جو صورت دکھائی۔ قسم جناب امیرؑ کی عید کا چاند ہو کر رہ گئے ہو میاں تم تو۔ اور احباب کیا دیکھتے ہیں کہ صاحب گورنر بہادر مسٹر میلکم ہیلی گاڑی سے اتر کے چلے آتے ہیں۔ ہائے کیا شاندار لوگ تھے۔ کیا محبتیں کیا وضعداریاں تھیں۔ ایک زمانہ وہ بھی عباسی خانم نے دیکھا تھا اور اب یہ دیکھتی تھیں کہ باہر خاک اڑتی ہے گھوڑوں کی سفید جوڑیوں اور بگھیوں کی جگہ ایک حماقت زدہ سی موٹر پیا برساتی میں کھڑی ہے۔ دوسری کے انجن کے نیچے ہاتھ منہ بھرا نیلا کئے پی جو بھیا لیٹے جانے کیا سٹر پٹر کر رہے ہیں۔ روشنی بٹیا بالوں کی مینڈھیاں گوندھنے کی بجائے دو پٹہ اڑاتی سائیکل پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔ کہاں گئی ہیں کہ بھئی ٹینس کھیلنے جا رہی ہیں۔

ریاست کی ماہانہ آمدنی گھٹتے گھٹتے پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔ ملازمین کا اتنا بڑا عملہ رکھنے کی اب نہ ضرورت تھی نہ اس کا خرچ پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن کنور صاحب پرانے

نمک خواروں، بوڑھے سربراہکاروں، منشیوں اور سپاہیوں کو وظیفے دئیے جاتے تھے۔
پہلے لکھنؤ کے ہر خاندانی رئیس کے گھرانے میں جلسنیں ملازم ہوا کرتی تھیں جو محرم کے
دنوں میں اعلیٰ درجے کی سوزخوانی کرتی تھیں اور ماتم تو اس قدر زوروں کا کرتی تھیں کہ
دیکھنے والوں کو غش آجائے۔ غفران منزل میں بھی ایک زمانے میں وسیوں جلسنیں موجود تھیں
زمرد اور الماس ان کی آخری یادگار رہ گئی تھیں۔ غفران منزل کوئی چالیس پینتالیس برس
پہلے بڑے کنور صاحب مرحوم نے صاحب لوگوں کے کہنے سے شہر کے باہر چیر یا جھیل
میں اس لئے بنوائی تھی کہ یہاں سکندر باغ کی عمدہ مٹی میں بہت نفیس باغ تیار ہوگا۔ ہائے
چیر یا جھیل کے نام سے سینے پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ عباسی خانم کہتیں۔ کیا
دن تھے۔ جب لکھنؤ لکھنؤ تھا۔ ارے اب یہ کونوں شہروں میں شہر ہے۔ موئے دیس دیس
کا جناور آکر بھر گیا ہے۔ مارا کو ایک بنگالی، پنجابی، سندھی، دلی والے۔ سب ہی آبسے ہیں
یہاں کی لگاڑ دی۔ ہوا کو یہاں کی گندا کر دیا۔ ایک زمانہ تھا کہ بھینسا کنڈا اور چیر یا جھیل
اور بدریا باغ، سکندر باغ، دلکشا سب جگہ صرف صاحب لوگوں کی کوٹھیاں تھیں یہ
حضرت گنج جہاں شام کو لڑکوں اور لڑکیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تو بیٹیا یہاں
یہ نگوڑے تمہارے کافی ہاؤس تھے نہ یہ انگریزی بائیسکوپ۔ بس مرے کمپنی اور
[illegible] کی دوکان تھی اور ایسی دو چار اور انگریزوں اور پارسیوں کی دوکانیں تھیں
صرف صاب میم لوگ باہر گھومتے تھے۔ ٹھنڈی سڑک پر جب اندھیرا پڑے سفید
[illegible] والی گاڑیاں نکلتی تھیں تو شام اودھ کا سماں دیکھنے والا ہوتا تھا۔ پہلی موٹر یا
[illegible] لاٹ صاحب کے بعد بڑے کنور صاحب جنت مکانی کی آئی تھی کلکتے سے
منگوائی گئی تھی اور اس پر بیٹھ کر وہ لاٹ صاحب سے ملنے گئے تھے۔ کبھی کبھی کلکتے

بمبئی کی تھیٹر کمپنیاں آکر تماشے دکھاتی تھیں اور سب لوگ کس شوق سے جاتے تھے۔
کلکتے والی گوہر ہائے کیا غضب کا گاتی تھی اور شکل تو خدا نے اس کی اپنے ہاتھ سے ایسی
بنائی تھی کہ یہ تمہاری نگوڑی سینما والیاں جو پوڈر سرخی کے زور پر چمکتی ہیں۔ اس کے آگے
پانی بھرتیں۔ بڑے کنور صاحب مرحوم نے اس کا مجرا کروایا تھا۔ سب بڑے بڑے
صاحب لوگ تلک سننے کے لئے آئے تھے۔ بڑے کمرے کی شہ نشینوں میں چلمنوں
کے پیچھے بیگمات بیٹھی تھیں۔ چھوٹے کنور صاحب کی اس وقت شادی نہیں ہوئی تھی
اور وہ ولایت میں تھے۔ ہائے لکھنؤ۔ ہائے لکھنؤ کی باتیں۔ شاہ میناؒ صاحب کے ہاں
کی قوالی عیش باغ کے میلے۔ درگاہ حضرت عباسؓ کی مجلسیں۔ بیلی گارد۔ دلکشا محل۔ مارٹین
کوٹھی۔ خورشید منزل کی ولایتی قلعوں جیسی عمارت جس میں اب انگریز لڑکیوں کے لئے
لا مارٹینیر کا اسکول ہے چپے چپے سے پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں یہ تھا۔ وہاں
وہ تھا۔ شاہی کے زمانے ہی میں بہت سے جدت پسند امراء و نوابین نے جن میں سے
چند ایک ولایت اور بہت سے کلکتے ہو آئے تھے۔ شہر کے باہر بندریا باغ اور دلکشا
میں یہ کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ جو بے حد انگریزیت پسند تھے۔
انہوں نے مارٹن صاحب فرانسیسی سے مارٹین کوٹھی خرید لی تھی۔ انہیں مارٹن صاحب کا
قائم کیا ہوا لا مارٹینیر اسکول اور لڑکوں کا لا مارٹینیر کالج ہے جس کے انگریز لڑکوں نے
غدر کے زمانے میں لکھنؤ کے محاصرے کے وقت اپنی قوم کے لئے کس بہادری سے
اپنی جانیں دی تھیں۔ ہائے اگلے وقتوں کی ہمتیں۔ وفاداریاں۔ آن پر جان دیتے تھے
جب گومتی میں بڑی بھیا آئی ہے۔ اس وقت تمہارے موتی محل کے پل پر کشتیاں چلتی
تھیں اور یہ کیننگ کالج جو اب الوِرسٹی کہلاتا ہے جس میں روز ایک نہ ایک دنگا

فساد ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لڑکے جانے کون کون ماؤں کے لال اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان کشتیوں میں ڈونگوں کو بچانے پھرتے تھے۔ آج کل کے چھوکرے ایسا کر سکتے ہیں؟ مصیبت پڑے گی تو خود ہی چلائیں گے کہ لوگو دوڑنا ہمیں بچانا۔ جب بڑے کنور صاحب نے شہر سے باہر کمپو میں غفران منزل بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی اللہ بڑی بہو صاحب نے انکار کر دیا تھا کہ میاں صاحبزادے میں تو آغا میر کی ڈیوڑھی سے باہر تو ہرگز نہ جاؤں گی۔ مرنے سے پہلے تو نکلنے کی نہیں۔ ہاں جب مجھے عیش باغ نے جا ملکہ جہاں کے قبرستان میں ڈال آئیو۔ اس کے بعد جہاں چاہنا رہنا۔ چاہے سکندر باغ میں رہنا چاہے ولایت میں۔ لو غضب خدا کا لڑکا باؤلا ہوا ہے۔ کہتا ہے شہر کے باہر چل کر کوٹھی میں رہو۔ کل کہے گا سایہ پہن کر میز کرسی پر بیٹھو۔ شہر کا باہر موا اُجاڑ رمنا جنگل بیابان۔ اور پھر وہاں ہر جمعرات کو میری مجلسیں کون کروائے گا۔ کیا تمہاری بگڑی ہوئی تہذیبیں میری مجلسیں پڑھنے آدیں گی۔ غفران منزل بن گئی۔ لیکن بڑی بہو صاحب نے اپنے جیتے جی آغا میر کی ڈیوڑھی سے قدم باہر نہ نکالا۔ صرف کبھی کبھی ماتا ٹھیر ہو آتی تھیں اور نجف آباد تک جانے کے لئے مہینوں پہلے سے کیا کیا انتظام ہوتے تھے۔ ایسی ہل چل ہو جاتی تھی جیسے ماشاء اللہ سے گھر میں شادی ہے۔ اب کیا ہوتا ہے کہ روشی بٹیا ولایت جا رہی ہیں اور ایک چھوٹا سا بیگ کندھے سے لٹکا کر جیپ پو ممی کہتی ہوئی کھٹ سے ہوائی جہاز میں جا بیٹھیں۔ عباسی خانم یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ فونوگراف باجا سب سے پہلے غفران منزل میں آیا تھا۔ کیا کیا ریکارڈ تھے۔ چھپن چھری اور کلکتے والی گوہر کے۔ کہ ایک ایک شعر پہ دل لوٹ جاتا تھا اور اب کیا دیوانے گانے نکلے ہیں کہ چڑیوں کوؤں سے سوال کئے جا رہے ہیں۔ کوئی پنچھی اڑا رہا ہے۔ کہیں چھک چھک ریل گاڑی چلی جاتی ہے۔ توبہ

ہے ۔!! عباسی خانم بھی کیا بلبل ہزار داستان تھیں۔ اپنی جوانی کے دنوں میں کیا ممولے کی طرح ادھر سے ادھر چہکتی پھرتی ہوں گی۔ اب بھی جاڑوں کی راتوں میں گاؤ تکیے سے لگ کے ڈلی کاٹتے ہوئے جب وہ پرانے دنوں کے قصے سنانے پر آتی تھیں تو سب انتہائی انہماک سے بیٹھے ان کی شیریں آواز سنتے رہتے تھے۔

زندگی اسی طرح گذرتی جارہی تھی۔

رات کو گومتی کے کنارے سے واپس گھر پہنچ کر سید افتخار علی سوچ رہے تھے کہ یہاں کا بھی عجیب ہی حساب نظر آتا ہے۔ انہوں نے اندازہ لگانا چاہا تھا کہ اس شہر کے انتہا پسند یا ترقی پسند نوجوان حلقے کی اکثریت کس طرف جارہی ہے اور انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہورہا تھا کہ ان راجاؤں اور تعلقداروں کے لڑکوں اور لڑکیوں سے لے کر متوسط طبقے اور پڑھے لکھے نچلے متوسط طبقے تک سبھی اپنے آئیڈیلز کے لیے متحد ہیں۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فرقہ وارانہ پارٹیوں اور گروہوں کی وہاں پر بھی کمی نہ تھی اور وہ خوب زور پکڑ چکے تھے۔ لیکن یہ حلقہ ان سب سے الگ تھلگ دوسروں کو گالیاں دینے اور اپنا پروپگنڈہ کرنے کے بجائے خاموشی اور خلوص سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ ملک کی ایک بڑی قومی جماعت کے ترقی پسند عناصر سے ہمدردی رکھنے والے اس گروہ میں سرمایہ دار بھی تھے، بورژوا بھی اور پرولتاری بھی۔ لیکن کوئی پوزیر نہ تھا۔ فریب دینے والا نہ تھا۔ یہ لوگ برلاز اور ڈالمیاز کو گالیاں دینے کے بعد صوفوں پر نیم دراز ہو کر سگریٹ سلگانے کے بجائے اپنی موٹروں پر بیٹھ کر کسانوں کے لیے کام کرنے کے واسطے دور دراز کے علاقوں تک جاتے تھے اور کلب کی لاؤنج میں بیٹھ کر سیاسیات

پر بحث کر لینا ہی کافی نہ سمجھتے تھے۔ بڑے عجیب لوگ تھے۔ سید افتخار نے نیوا یرا کے فائل اٹھا کر دیکھے۔ یہ بھی بے حد انوکھا رسالہ تھا جسے 'راجکماریاں' اور دھوپ میں پیدل گھومنے والے 'فن کار' اکٹھے مل جل کر شائع کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی ان کا ذاتی پروپگنڈہ کہیں نہ تھا۔ بہرحال ایک رات ان کی مجلس میں شامل ہو کر اور اپنے ساتھی رحمت اللہ خان سے ایک تقریر کروا لینے کے بعد اب سید افتخار نے اندازہ لگایا کہ ان نوجوان دیوانوں سے الجھنا اور ٹکر لینا زیادہ آسان کام نہ تھا۔ لیکن رحمت اللہ خاں اب ملتِ بیضا شائع کر رہا تھا اور یہ یقین تھا کہ یہ اخبار نیوا یرا کے مقابلے میں موجودہ حالات اور ذہنیت کو دیکھتے ہوئے کہیں زیادہ کامیاب رہے گا۔ اگلے ہفتے وہ اضلاع کے دورے پر جانے والے تھے۔ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے انہیں دیہاتوں اور قصبوں اور ضلعوں کے چھوٹے چھوٹے دورافتادہ شہروں میں جہاں اب تک قومی اور سیاسی شعور کی لہر بدقسمتی سے نہ پہنچی تھی اسٹڈی سرکل قائم کرنے اور پروپگنڈے کی رفتار دوگنی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ان کی جماعت کی تحریک اپنی زبردست جذباتی اپیل کی وجہ سے ملک کے گوشے گوشے میں بے حد کامیابی اور تیز رفتاری کے ساتھ پھیل چکی تھی۔ یہ صوبہ اس تحریک میں سب سے پیش پیش تھا کرواہاراج اودھ کے ترقی پذیر مسلمان حلقوں میں سے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے کنور صاحب کی اولاد میر جعفروں میں شامل ہو گئی تھی۔ راجکماری تو اکثر پیشانی پر سرخ بندی تک لگائے دیکھی گئی تھی۔ نہرو خاندان کے افراد سے کرواہاراج والوں کی بہت گہری دوستی تھی۔ "ایسے ہی لوگ تو قوم کو فروخت کر رہے ہیں" — سید افتخار نے قلم اٹھا کر ملتِ بیضا کے لئے ایڈیٹوریل لکھنا شروع کیا۔

"کیوں بھئی — کیا رخشندہ بیگم کو خط لکھا جا رہا ہے" رحمت اللہ خان نے کمرے

میں داخل ہوتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ہاں ہٹاؤ بھی۔ ان سب کے دماغوں میں تو بھُس بھرا ہے"۔ سید افتخار نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اب کے الیکشن پہ مزا دیکھ لینا۔ جاویں گے کہاں۔ ان کے حلقے کے سارے ووٹرز تو ہمارے ہاتھ میں ہیں"۔ رحمت اللہ خاں نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ کرداہار لج کے سارے علاقوں میں جو فیض آباد سے لے کر ترائی کے جنگلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوتا جارہا تھا۔

سید افتخار نے اپنی ڈائری اٹھائی اور دیکھنے لگے کہ آئندہ ہفتہ ان کا کس حد تک مصروف ہے۔ قومی راہنماؤں کی ساری ٹی پارٹیوں میں ان کی شرکت بیحد ضروری تھی۔ ایک رہنما خاتون کے ایٹ ہوم کا دعوت نامہ ان کے سامنے پڑا تھا جو رحمت اللہ خاں کے ذریعے انہیں بھیجا گیا تھا۔ دلچسپ ایٹ ہوم ہوگا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ ان ٹی پارٹیوں میں قوم کی رہنما خواتین کی شرکت جو قوم کے پلیٹ فارم پہ لاکھوں، کروڑوں، غریب، ان پڑھ پردہ دار عورتوں کے گلّوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ پیرس کی تازہ ترین فیشن پریڈ سے کم اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ان کے جگمگاتے ہوئے غرارے اور ساریاں، ڈرائینگ روم پولیٹکس کے مکالمے چمکیلی موٹریں، یہ سب بہت شاندار، بہت نظر فریب معلوم ہوتے تھے۔۔۔ یہ قوم کی لیڈرشپ تھی۔ ان کے وہاں روز ایٹ ہوم ہوتے تھے۔ ان کی تصویریں اخباروں میں چھپتی تھیں جب تک قوم کے رہنما اور ان کی خواتین شاندار نہ ہوں۔ قوم کیا خاک ترقی کر سکتی ہے اور اس میں قومی جوش اور سیاسی شعور کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے۔۔۔

اور ان کے مقابلے میں وہ پرزئیرز کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ جن کی خواتین اور لڑکیاں سفید ریا
اور سیدھے سادے غرارے پہن کر باہر نکلتی تھیں اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف
رہتی تھیں "۔۔۔ ہونہہ۔" سید افتخار نے اڈیٹوریل میں آگے لکھنا شروع کیا۔ "کھدر یا
مرشد آبادی ریشم کی ساریاں پہن لینے سے ملک کیا آزاد ہو جائے گا۔ اندر چاہے جو
کچھ بھی کرتی ہوں۔ باہر سفید ساریاں پہن کر نکلتی ہیں سینکڑوں لونڈوں سے تو عشق
ہی کر کے چھوڑ دیا ہوگا۔ جیل جا کر بھی ان لوگوں نے کیا تیر مار لئے ہیں۔ اے
کلاس میں ٹھاٹھ سے بجلی کے پنکھوں کے نیچے بیٹھے ہیں۔ پبلسٹی ہو رہی ہے وہ الگ اور
ساتھ ساتھ عشق لڑائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ کبھی کبھار انگریز پلس افسروں سے
پٹ لئے اور لہولگا شہیدوں میں داخل۔ اور ایک عالم ان کے نام پر مرا جاتا ہے۔
یہ سب پروپیگنڈہ ہے بھائی پروپیگنڈے میں بڑی طاقت ہے۔ مجھے تم آج نیویارک
بھیج دو۔ دیکھو کیا کر سکتا ہوں محض روپیہ چاہئے میاں روپیہ" انہوں نے رحمت اللہ
خاں سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو بھائی۔" رحمت اللہ خاں نے جواب دیا۔ اخبار کے نئے مضمون
کے لئے ان کے دماغ میں بھی کافی مسالہ جمع ہو گیا تھا۔

وقت اپنی روانی سے گزرتا گیا۔ گرمیاں گئیں۔ برسات نکلی۔ گلابی جاڑے آن پہنچے
جاڑے، جب مشاعروں اور کانفرنسوں اور نمائشوں کا زور ہوتا ہے۔ شکار پارٹیاں
گھنے جنگلوں کا رخ کرتی ہیں۔ کرسمس کی چھٹیوں کے پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ آتشدان
کے گرد بیٹھ کر گپیں اڑتی ہیں اور دور دور کی کھینچی جاتی ہے۔

نومبر کا مہینہ آیا اور دیوتے کی سالانہ نمائش کے لئے سارے لکھنؤ نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی۔ نمائش کے میدان سے ذرا ہٹ کے' اس سمے امرودوں کے جھرمٹ میں وقت گذاری کے خیال سے انور اعظم اور جمیل بہت دیر سے ایک منڈیر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب انہوں نے لڑکیوں کے ایک غول بیابانی کو اس طرف آتا دیکھا تو سگریٹ پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو یار واپس چلیں۔" انور اعظم نے کہا۔

وہ سب ٹہلتی ہوئی امرودوں کے جھنڈ سے آگے نکل آئیں۔

"بجیا کا تم ان کا جینہت ہو؟" قمر آرا نے منڈیر پر سے کودتے ہوئے انور اعظم کو دیکھ کر چپکے سے رخشندہ سے پوچھا۔

"چینہت کا ہے ناہیں۔" رخشندہ نے کہا۔ وہ ڈون انور دی گریٹ کو کئی بار لکھنؤ میں اپنی نیلی ٹو سیٹر پر گھومتا دیکھ چکی تھی۔

جنگل کی ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ ارہر کے کھیتوں کے اس پار ندی کا پانی ستاروں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ وہ سب شالیں اور اوورکوٹ اپنے شانوں پر لپیٹ کر اسی منڈیر پر جا بیٹھیں جس پر سے وہ دونوں بھاگے تھے۔ وہاں پر نسبتاً سکون تھا۔ دور دور تک چھپروں اور سائبانوں کے نیچے لالٹینوں کی روشنی میں بیٹھے ہوئے کسان ناریل پی رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ بیل گاڑیاں درختوں کے نیچے کھڑی کر دی گئی تھیں اور جگالی کرتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ آم کے باغ کے بڑے حکام ضلع کے خیمے تھے جن کے چاروں طرف سرخ بجری والی سڑکیں تھیں، اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پام کے گملے رکھے تھے۔ نمائش کے میدان کے وسط میں میوز

کانفرنس کے پنڈال پر رنگ برنگی کاغذی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ نمائش کے میدان اور صاحب لوگوں کے کیمپ سے کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر مٹی کے کھلونوں اور رنگ برنگی چنریوں اور گوٹے لچکوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں جن پر لالٹینیں ٹمٹما رہی تھیں اور ہنڈولے چرخ چوں کر رہے تھے اور آدھی عورت اور آدھی لومڑی کا تماشہ تھا۔ جگمگاتی ہوئی فیشن ایبل نمائش گاہ سے بہت پرے ہٹ کر یہ غریب مسلمان کسانوں کی اپنی نمائش تھی۔ امرودوں کے باغ کے دوسری طرف مویشیوں کا میلہ لگا تھا۔ ان گنت گھوڑے، بکریاں اور گائے بیل درختوں کے نیچے کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر پریچہرہ نسیم اور گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تلوار لئے غازی انور پاشا اور گاما پہلوان کی رنگین تصویریں جگمگا رہی تھیں۔

انور اعظم اور جمیل ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ ان کے سامنے ایک بالکل نئی دنیا بکھری ہوئی تھی۔

ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے چبوترے پر چڑھے ہوئے ایک صاحب دریافت فرما رہے تھے۔ "رس گلا کھائیے گا؟"

"یار مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وارث علی شاہ کے عرس میں رس گلوں کا لنگر بھی ہوتا ہے"

جمیل نے کہا۔ وہ دونوں چبوترے کے قریب سے گذرے۔ انہیں دیکھ کر کسانوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ پتہ چلا وہ صاحب فرماتے ہیں۔ "رسول اللہ کا ہے گا"۔ یعنی وہ بھورا سا پرانا کمبل جس کی زیارت کروا کے دو دو آنے پیسے وصول کئے جا رہے تھے۔

"وجو بنوا لو بھئی وجو"۔۔۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ایک بزرگوار مٹی کے لوٹے لئے سب مومنین کا وضو بنانے کو مستعد بیٹھے تھے۔ ایک درخت کے نیچے چراغوں

کی روشنی میں قوالوں کی چوکیاں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ کسانوں کا میلہ تو یہی تھا۔ وہ کسان جو کوسوں دور سے پیدل یا بیل گاڑیوں پر ہر سال حضرت وارث علی شاہؒ کے عرس کے لئے کس ذوق و شوق سے وہاں آتے تھے۔ ان کے بچے ہنڈولوں پر بیٹھتے تھے۔ ان کی بیویاں اور لڑکیاں چنریوں اور فیروزآبادی رنگین چوڑیوں کی خریداری کرتی تھیں اور وہ خود سال بھر کی محنت سے بچائے ہوئے کچھ روپوں سے ایک دو بیل یا گائیں خرید کر خوش خوش اپنے گاؤں کو واپس چلے جاتے تھے۔ باغ کے اس پار دیوے کی جو مشہور سالانہ نمائش برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی وہ ان کے لئے نہیں تھی۔

بارہ بنکی سے دیوے شریف آنے والی سڑک پر موٹروں، لاریوں، تانگوں، یکوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ امرودوں کے جھنڈ کے پرے اس میدان میں کتنی رونق، کتنی چہل پہل تھی۔ ایک عالم وہاں سمٹ آیا تھا۔

رخشندہ امرود کے سہارے کھڑی ہو گئی "رات کا وقت ہے۔ ورنہ امرود چراتے" اُس نے ایک ٹہنی جھکا کر کہا۔

قمر آرا خاموش تھی۔ وہ اپنی اس چچا زاد بہن اور اس کی الٹرا فیشن ایبل سہیلیوں کے درمیان کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ ندی کے پرے چھوٹی لائن کی کھلونہ ایسی ٹرین گڑگڑاتی شور مچاتی سیتاپور کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ فضا بھیگی بھیگی تھی اور لگتا تھا جیسے بہت دور اندھیرے میں گنار کی ڈوبتی ہوئی گونج کے ساتھ ساتھ کوئی اختر پیا کا گیت الاپتا ہو ــــ کبھی بولے چھن کبھی بولے چھن کبھی بولے چھن تیرے گنگھرو"۔

"روشی اب واپس چلو۔ بہت دور نکل آئے ہم لوگ"۔ ڈائمنڈ نے کہا۔

"چلو ریل کی پٹری اور ندی کے کنارے تک ہی ہو آئیں کم از کم۔ راستے میں جو جناتوں کی حویلی ہے اسے دیکھتے چلیں گے۔"

"خاکسار تو جائے گی نہیں"۔ ڈائمنڈ نے فیصلہ کیا۔

"ارے کتنا ڈرتی ہو تم۔ چپراسی تو ہمارے ساتھ ہے۔"

"بھئی بندے خاں تو واپس جاتے ہیں اور اب میونک کانفرنس شروع ہی ہونے والی ہے"۔ ڈائمنڈ نے منڈیر پر سے کودتے ہوئے کہا۔

"واللہ کیا بات دماغ میں آئی ہے۔ قسم خدا کی۔ یوچھو کیا؟" رخشندہ بولی۔

"فرمائیے"۔ ڈائمنڈ نے اکتا کر کہا۔

"اب اتنی دور آ گئے ہیں تو چلو درگاہ شریف کی زیارت کرتے چلیں۔"

وہ پگڈنڈی پر آ گئیں۔ چپراسی جو اب تک ایک طرف کو کھڑا اپنی سرخ مونچھوں کی نوک مروڑ رہا تھا۔ آگے آگے بھاگا گیا تاکہ درگاہ پر سے زائرین کا مجمع ہٹ جائے کیونکہ کلکٹر صاحب کے ہاں کی بابا لوگ زیارت کے لئے آ رہی ہیں۔

چپراسی آگے نکل گیا اور وہ اندھیرے میں راستہ بھول کر پگڈنڈی پر سے تتر بتر ہو گئیں۔

"جناتوں کی حویلی تو میں ضرور دیکھوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو"۔ رخشندہ نے دل میں طے کیا ڈائمنڈ، گنی، قمر آرا اور دوسری لڑکیاں کھیت میں سے گذر کر آم کے باغ تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ ایک چھلانگ لگا کر منڈیر کی دوسری طرف اتر گئی۔ ایک بہت بڑے برگد کے درخت کے پیچھے غازی الدین حیدر کے وقتوں کے ایک کھنڈر کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ کھنڈر کی محرابوں میں سے ندی کا ٹھنڈا پانی جھلک رہا تھا

ہمت کر کے وہ آگے بڑھی۔ کیونکہ اب واپس جانا بزدلی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہوا کوئی دیہاتی چلم پیتا ضرور مل جائے گا اور اسے ساتھ لے کر وہ واپس چلی جائے گی۔

"ارے ہائے جنات"۔۔۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا لیکن دوسرے لمحے اسے ہنسی آ گئی۔ کیونکہ اس کے سامنے سیڑھیوں پر حویلی والے جناتوں کے بجائے سیاہ شیروانیوں میں وہی دونوں کھڑے تھے جو کچھ دیر پہلے منڈیر پر سے بھاگے تھے۔

امبرپور راج کے انور اعظم نے ایک لمحے کے لئے اسے بالکل اپنے سامنے کھڑا دیکھا جو اندھیرے جنگلوں میں ڈولنے والے پراسرار سایوں کی طرح درختوں کی تاریکی میں سے نکل کر اکیلی جانے کس طرح وہاں پہنچ گئی تھی۔

"ارے پارٹنر غول بیابانی تو یہاں بھی پہنچ گیا" جمیل کہہ رہا تھا جمیل اس کے بالکل قریب کھڑا تھا لیکن اس کی آواز لگ رہا تھا جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی لیکن وہ حماقت انگیز طلسم بہت جلد ٹوٹ گیا۔

"ارے بھئی واہ" اس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا اور زنبر کی سی تیزی سے مڑ کر پگڈنڈی پر جھکے ہوئے ارہر کے لمبے زرد ڈنٹھلوں کو ہٹاتی پھر منڈیر پر پہنچ گئی۔

"روشی"۔ دور سے گنّی کی آواز آئی۔

"روشی"۔ ڈائمنڈ نے پکارا

"ارے ہم جناتوں سے ملاقات کر بھی آئے" بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"واللہ۔۔۔ کون؟"

"ڈوَن انوزدی گریٹ۔"

"ارے وہ گلیمر بوائے"؟

"وہی جو پچھلے سال ریڈیو اسٹیشن پر وِل کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لئے آتا تھا"؟

"فرائیڈے ایوننگ ؟ وہی جو ہر ہفتے نئی پکچر شروع ہونے پر پہلی شام کو نظر آتا ہے۔"

"ہُوازہو" کے باب کھل گئے۔

درگاہ میں خوب تیز روشنی پھیل رہی تھی۔ پھولوں کی چادروں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر آنچلوں سے سر ڈھک لئے اور فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھالئے۔ گنتی اور راوتا ایک طرف کو کھڑی رہیں۔

"بھئی اب دعائیں مانگی جائیں۔ قبولیت کا وقت معلوم ہوتا ہے۔" ڈائمنڈ نے کہا "کیا دُعا مانگی جائے"۔ رخشندہ سوچنے لگی۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ آخر کاہے کے لئے اللہ میاں سے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

مانا ہسپیکیر کی قمر آرا مزار کے ایک طرف ہاتھوں میں مُنہ چھپائے کھڑی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ بھائی میاں واپس آجائیں"۔ وہ روز عشا کی نماز کے بعد یہی دعا مانگتی تھی۔ اس وقت اس جگمگاتے مجمع میں بھی اسے یہی دُعا یاد آئی۔

"چلو بھئی!" رخشندہ نے کہا۔ وہ سب نمائش کا میدان پار کر کے اپنے کیمپ کی طرف آگئیں۔

میوزک کانفرنس کا پہلا سشن شروع ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔

"کس احمق نے اس سال نمائش کا انتظام کروایا ہے جو کہیں بھی ڈھنگ کی چائے نہیں ملتی۔ سارے ریسٹوران ایک سے ایک تھرڈ کلاس۔" انور اعظم اور اس کا دوست جمیل کچھ دیر سے ایک ریسٹوران کے خیمے میں آئے بیٹھے تھے اور پیالیوں میں چمچے بجا رہے تھے۔

"کہیں زور سے کہہ بھی نہ دینا۔ یہ جو ابھی ایک غول بیابانی دوسری طرف سے ریسٹوران میں داخل ہوا ہے۔ اس میں حاکم ضلع کی بھانجی صاحبہ تشریف رکھتی ہیں" دوسرے دوست نے کہا۔

"اچھا یہی وہ کلکٹر صاحب کی شہرۂ آفاق بھانجی کردا ہاؤس کی رخشندہ بیگم ہیں جو دوسری بابا لوگ کے ساتھ لکھنؤ سے نمائش دیکھنے تشریف لائی ہیں؟" تیسرے نے ناک سکیڑ کر دریافت کیا۔

"یار تمہیں تازہ ترین اطلاعات پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ سب تفصیلات کیسے معلوم ہوئیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"بھئی ایک تو کلکٹر صاحب کے کیمپ میں غفران منزل کی اسٹوڈی بیکر کھڑی ہے اور یہ اسٹوڈی بیکر جانتے ہو کب کی ہے؟ اسی پر سوار ہو کر باوا آدم جنت سے تشریف لائے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی یہ سرخ وردی والا طرہ باز خان چپراسی کرسیاں گراتا ریسٹوران میں گھسا تھا اور منیجر سے کہہ رہا تھا کہ کلکٹر صاحب کے ہاں کی بابا لوگ چائے پینے آتی ہیں۔ ادھر کسی کو نہ آنے دینا" اسی دوست نے بتایا۔

"بھئی جانے یہ کونسی ادا ہے کہ ابھی ساری نمائش کا چکر لگا کر آرہی ہیں اور یہاں پردہ کیا جا رہا ہے" چڑنے والے دوست نے کہا۔

"بھئی ہٹی۔۔۔ ہائے علیگڑھ کی نمائش کے کباب پراٹھے" جمیل نے ایک

سرد آہ بھری۔

"ان کا یہاں کیا تذکرہ؟" انور اعظم نے پہلی مرتبہ اس مکالمے میں حصہ لیا۔ وہ اب تک چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا رہا تھا۔

پارٹنر ابھی سامنے سے ایک سیاہ برقعہ گذرا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنے علی گڈھ کی نمائش یاد آ گئی۔ واللہ کیا خیال ہے اب کی فروری میں آؤ علی گڈھ۔"

"کوئی نیا رومان چل رہا ہے؟" ایک دوست نے پوچھا

"پارٹنر ان دنوں بی ایس سی کی ایک لونڈیا کو فزکس پڑھا رہا ہوں۔ واللہ کیا چین کی گذرتی ہے۔" جمیل نے جواب دیا۔

"لاحول ولا" انور اعظم کو ہنسی آ گئی۔

پام کے گملوں کے پرے قناتوں کی دوسری طرف لڑکیاں اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ ریسٹوران میں خوب گہما گہمی تھی۔ لکھنؤ سے آئی ہوئی خواتین خریداری کے سامان سے لدی پھندی آ کر بیٹھتیں اور چائے سے تازہ دم ہو کر پھر نمائش گاہ کی طرف چلی جاتیں۔ باہر لاؤڈ اسپیکر پر فلمی گانوں کے ریکارڈ چیخ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد پی چو بھی وہاں آ گیا۔ "ارے بھئی تم کیا کر رہی ہے؟" اس نے اپنی بہنوں کی میز کی سمت آتے ہوئے کہا۔

"پی چو تم بھی کمال کرتے ہو۔ تم نے ہم سب کو مدعو کیا تھا کہ چائے پلاؤ گے۔ ہم سب بھاگے بھاگے آئے کہ پی چو خاں سے اپوائنٹمنٹ ہے اور آپ غائب۔" رخشندہ نے بگڑ کر کہا۔

"بھئی روشی ماموں میاں نے پکڑ لیا تھا۔ ان کے خیمے میں جانے کون کون جمع ہے

سب کی میزبانی کرنی پڑ رہی تھی۔ اچھا بتاؤ کیا نوش فرماؤ گی تم لوگ"۔ اس نے پوچھا
"چاٹ"۔ سب نے یکزبان ہو کر کہا
"ارے بس لڑکیوں کی اوقات! چاٹ پر جان نکلتی ہے!! پی چو بولا۔
"اور پی چو ٹنڈے کے کباب"۔ رخشندہ نے لالچی بلی کی طرح فرمائش کی۔ ٹنڈا اپنی دوکان لے کر ہر سال لکھنؤ سے دیوے شریف آتا تھا۔
اسی وقت ادھر سے نواب چھتاری اسٹائل کی مونچھوں والے حاکم ضلع گذرے
"روشی بٹیا یہاں پر ہیں"۔ ان کی گرجدار آواز آئی۔
"جی ماموں میاں ہم ابھی آتے ہیں"۔ رخشندہ نے کہا اور وہ سب جلدی جلدی چاٹ اور کباب صاف کر کے پی چو کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ کیمپ میں شاید رات کے کھانے پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔
انور اور اس کے ساتھی پام کے گملوں کے ادھر اسی طرح کانفرنس شروع کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سرخ اور سنہری وردی اور سرخ مونچھوں والا طرہ باز خاں چپراسی ان کی طرف آیا۔
"امیر پور راج کے صاحبزادے یہاں تشریف رکھتے ہیں"۔ اس نے بے حد مؤدبانہ لہجے میں دریافت کیا۔
"ارشاد؟" انور نے لاپروائی سے پوچھا
"حضور کو کلکٹر صاحب یاد فرماتے ہیں"۔
"اچھا جاؤ۔ کہدو ہم ابھی آتے ہیں"۔
کلکٹر صاحب کے ڈرائینگ روم والے خیمے میں اچھا خاصا دربار لگا تھا۔

ایک صوفے پر مہاراجہ صاحب عالمگیر آباد اور ایڈمنڈ وائیلے ایس پی کے ساتھ کلکٹر صاحب بیٹھے مونچھیں ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے اور یہ موٹا سگار پیتے جاتے تھے اور بہت سے مقامی حکام اور رؤسا اور حوالی موالی چاروں طرف بیٹھے تھے۔

طرہ باز خاں نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور انور داخل ہوا۔ انور کو انہوں نے اوپر سے نیچے تک اس طرح دیکھا جیسے وہ بھی میلے میں آئے ہوئے انعام کے مستحق مویشیوں میں سے تھا۔ "جیتے رہو میاں۔ بیٹھو۔ کہو اب تمہارے چچا کی طبیعت کیسی ہے۔" انہوں نے فرمایا۔

انور ایڈمنڈ وائلے سے اودھ جم خانہ کے اگلے ٹینس ٹورنامنٹ کے متعلق باتوں میں مصروف ہو گیا۔

سگار پیتے پیتے کلکٹر صاحب نے یکلخت بے حد سنجیدگی سے فرمایا "میاں سنا ہے تم کو نمائش کے انتظام سے کچھ شکایت ہے کہ کسی ریسٹوران میں کھانا اچھا نہیں۔"

انور کو ہنسی آ گئی "چچا میاں آپ کو کیسے پتہ چلا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے بہت مستعد جاسوسوں کو بھی مقرر کر رکھا ہے۔" اس نے کہا۔

اس دروازے کے پردے کو جنبش ہوئی جو خیمے کے دوسرے حصے میں کھلتا تھا اور چوڑیوں کی مدھم سی جھنکار گونج اٹھی۔ پھر بہت سی لڑکیوں کی دھیمی ہنسی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ کلکٹر صاحب کے ڈرائینگ روم میں باتیں شدت کی تندہی سے کی جا رہی تھیں۔ اس لئے اس طرف کسی کا دھیان

کچھ دیر بعد کلکٹر صاحب کو یاد آیا کہ ٹھیک آٹھ بجے سے میوزک کانفرنس کا پہلا سشن شروع کر دیا جائے گا۔ اس لئے اب کھانے کے لئے چلنا چاہئے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ برابر کے خیمے میں اس نے کھسر پھسر سنی۔" چپراسی صاحب کو کھانا دکھاؤ۔ نہیں پہلے لے جا کر ٹہلاؤ۔ ویسے آپ عموماً کہاں بند ھتے ہیں ؟ — اچھا آپ کو پانی دکھاؤ۔ جناتوں کو کھانا کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی صرف بھٹیجر ریسٹورانوں کی چاد سونگھ کر زندہ رہتے ہیں۔ ارے مگر یہ گلیمر بوائے کتنا ہینڈسم لگ رہا ہے اس وقت — ذرا بھی نہیں سسی ہے بالکل۔"

کلکٹر صاحب کے ڈرائینگ روم والے خیمے سے واپس آنے کے بعد فوارے کے قریب الوز کو اپنے ساتھی مل گئے اور وہ سب کانفرنس کے پنڈال کی طرف چلے گئے۔ جدھر ساری دنیا اُمڈی جا رہی تھی۔

پنڈال میں اگلے صوفوں پر مہاراجہ صاحب عالمگیر آباد، ان کا اسٹاف، کلکٹر صاحب، ضلع کے دوسرے بڑے حکام اور لکھنؤ سے آئے ہوئے' بڑے آدمی' اور ان کی خواتین آ آ کر بیٹھ رہی تھیں۔ اسٹیج کے دونوں طرف چلمنوں کے پیچھے پردہ نشین خواتین کے لئے نشستیں تھیں۔ باہر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک خیمہ گرین روم کا کام دے رہا تھا۔ اس کے قریب اختری فیض آبادی کی پیکارڈ کھڑی تھی۔ اسٹیج کے پیچھے کی قناتوں سے گھنگھروؤں کا مدھم شور اور طبلہ اور بایاں ٹھکنے اور سازوں کے سر ملائے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فٹ لائٹ کے لیمپ اور مائیکروفون کے تار ٹھیک کئے جا رہے تھے۔ ایک طرف کو آل انڈیا ریڈیو کا ایک یونٹ ریلے کے لئے اپنا ساز و سامان لئے بیٹھا تھا۔ وِمل اور مسعود

ہیڈ فون لگائے تاروں سے اُلجھے جانے کس چکّر میں لکھنؤ اسٹوڈیوز سے باتیں کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پنڈال کے اندر زرد بیج لگائے آرٹ کے خدّام ورضاکار ادھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے اور معزّز خواتین کو لا لا کر اگلی کرسیوں پہ بٹھا رہے تھے۔

آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں عموماً یہی سب ہوتا ہے۔ جب سارا مجمع پردہ اُٹھنے کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ تب اگلی صفوں پر سے اٹھ کر ایک آدھ خان بہادر صاحب یا مہارانی صاحبہ مائیک پہ آ کے جو اکثر خیل ہو جاتا ہے۔ خطبہ صدارت عطا فرماتی ہیں جس میں ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی شاندار روایات اور موجودہ زبوں حالی اور ہندوستانی سوسائٹی کی فنونِ لطیفہ کی طرف سے مجرمانہ غفلت پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور کانفرنس کے منتظمین کو فن کی اس عظیم الشان خدمت پر جس کی وجہ سے آرٹ اور کلچر کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ مبارکباد دی جاتی ہے۔ مجمع اس خطبے سے اور بھی زیادہ اکتا جاتا ہے۔ تب اونکارناتھ ٹھاکر یا نارائن راؤ ویاس الہیا بلاول کا خیال شروع کرتے ہیں۔ تاری دید ے اپنے گھر کی۔ پرم پریت اُپ جاؤں ۔۔۔ سب سے پچھلی قطاروں میں اب تک جو چھوٹے پیمانے پر ہڑبونگ مچی ہوتی ہے۔ اس میں زیادتی ہو جاتی ہے اور وہاں سے ارشاد ہوتا ہے۔ ارے یار نالی دید ے اپنے گھر کی۔ اماں یہ کیا گلا پھاڑ رہا ہے بڈھا۔ اماں کلکٹر صاحب اختری بائی کو بھیجو۔ یہ کسے بٹھا دیا۔ ہمارا روپیہ ہی سوارت جاوے۔ اس کے بعد دو تین چھوٹی چھوٹی کائستھ بچیوں کے کتھک ناچ یا کائستھ اور بنگالی لڑکیوں کا رادھا کرشنا یا شیو پاروتی ڈانس ہوتا ہے۔ یا

کوئی صاحبزادی ہاتھ میں تھالی اور جلتے ہوئے دئیے لے کر تشریف لاتی ہیں اور یہ پوجا
ڈانس کہلاتا ہے یا ئمر پجامے کے ٹیلبو کی قسم کے لباس میں صراحی تھامے ایک خاتون
اسٹیج پر آرکسٹرا کی فلمی دھن کے ساتھ چہل قدمی فرمانے لگتی ہیں۔ یہ گویا اورینٹل ڈانس
ہوتا ہے اور اس طرح ہندوستانی رقص کی مٹی خراب کی جاتی ہے۔ یا پھر اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ منتظم صاحب گھبرائے ہوئے مائیک پر آ کر اناؤنس کرتے ہیں کہ الہ آباد
سے کماری آشا اوجھا کسی وجہ سے تشریف نہیں لا سکیں اس لئے افسوس کہ ان کا
رقص نہیں ہو سکتا۔ اب آپ لاہور کی مشہور فلم اسٹار مس ریوا آلور جان سے ایک
نغمہ سنئے۔ کوٹھے اتے ال ماہیا۔

اسی طرح جب اس روز دیوے شریف کی سالانہ آل انڈیا میوزک کانفرنس میں
بمبئی کی روشن آرا بیگم اور آگرے کی زرد اور خوبصورت انوری بائی جو بیچاری بعد میں مر گئی
اور آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں کو الاپنے الاپتے بہت دیر ہو گئی اور پچھلی قطاروں
کے حاضرین جمائیاں لینے لگے۔ تب لاؤڈ اسپیکر میں سے یہ روح افزا اطلاع آئی کہ
اب آپ کو مِس روز اور اُن کے بھائی جم مک گریگر کا رقص ملاحظہ فرمائیے۔
سارے شامیانے میں ہلکی ہلکی پُر اشتیاق کھسر پھسر ہونے لگی۔ پردہ ایک طرف کو سمٹا
اور سازوں کی دھمک کے ساتھ ایک بھورے بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی ناچتی ہوئی

مجمع کے سامنے آگئی۔

"یار ہم تو گیتا ماتھر کے ناچ کے انتظار میں تھے اور یہاں آ کے کیسی انگلو انڈین چھوکری کو کھڑا کر دیا۔" پیچھے سے کسی نے آہستہ سے کہا۔ لیکن سبھی منہ کھولے ناچ دیکھنے میں مصروف تھے۔

لال باغ کی اینگلو انڈین اور عیسائی بستی میں چند لڑکیاں ایسی بھی ہیں جن کے فلیٹوں کے دروازوں پر ہندوستانی ناموں کے بورڈ لگے ہیں۔ پرمیلا رانی۔ امینہ بیگم۔ اوشا دیوی بظاہر وہ محض ہندوستانی رقص کرتی ہیں۔ ایک آدھ نے تخیل کی بلند پروازی سے کام لے کر اکیڈمی آف اورینٹل ڈانسنگ بھی کھول رکھی ہے۔ جہاں آس پاس کی لڑکیاں جمع ہو کر گراموفون کے ریکارڈوں پر اچھل کود میں مصروف رہتی ہیں اور بالکنی میں کھڑے ہو کر چوئنگ گم کھاتی جاتی ہیں ۔ یہ کوئین روز بھی قطعی وہیں سے آئی تھی۔

وہ ناچتی رہی۔ بے حد معمولی قسم کا ناچ۔ عام سی دھن۔ پھر اس کے بھائی ایک سولہ سترہ سالہ خوش شکل اینگلو انڈین لڑکے نے سیاہ شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامے میں کتھک ناچ کیا۔ وہ کافی اچھا لگا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ اگلے صوفے پر بیٹھے ہوئے مہاراجہ صاحب عالمگیر آباد جمائیاں لینے لگے۔ دوسری صف میں کلکٹر صاحب کے ہاں کی بابا لوگ کو نیند آنے لگی۔ تیسری صف میں انوار اعظم اور اس کے ساتھی سونے کا ارادہ کر رہے تھے۔

اتنے میں اسٹیج پر اختری بائی فیض آبادی نے الاپنا شروع کیا ـــــ اکیلی جن جیو راودھے جمنا کے تیر۔

لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑیں۔

جمیل نے انور کو دیکھا اور وہ بھی ہنس پڑا۔

"روشنی اب ایک بج رہا ہے۔" ڈائمنڈ نے آہستہ سے کہا۔

"چلو اُٹھتے ہیں۔" رخشندہ نے نیند سے مچتی ہوئی آنکھیں بمشکل پوری طرح چیر کر کہا چپراسیوں اور رضاکاروں نے فوراً ان کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور وہ اپنے اوور کوٹ اور شالیں سنبھالتی اپنے خیموں کی طرف چلی گئیں۔

کانفرنس کے اختتام پر جب انور اعظم پنڈال سے باہر آ رہا تھا تو اُس نے کوئین روز کو شامیانے کے رسّوں کے سہارے جھولتے ہوئے اپنے باپ سے باتیں کرتے دیکھا۔ اس کی سفید انگلیوں میں سگریٹ جل رہا تھا اور اس کے بھورے بالوں میں مصنوعی ستارے جگمگا رہے تھے۔ کانفرنس کا سکرٹری ایک مقامی پی۔ سی ایس جگدیش چندر ان لوگوں کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"اجی میں نے کہا سرکار ذری ادھر تشریف لائیے گا۔" جگدیش نے انور اعظم کو آواز دی۔

"ہلو جگدیش۔" انور اعظم نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"بھئی امبر پور راج کے کنور انور اعظم مس کوئین روز۔ ان کے ڈیڈی مسٹر چارلس مک گریگر۔" جگدیش نے ملوایا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

انور اعظم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جگدیش کو اس قسم کے تعارف کرانے کا شوق کب سے ہو گیا ہے۔

"انور یار تم لکھنؤ کب جا رہے ہو واپس"

"بھائی اگر تمہاری اس زبردست میوزک کانفرنس کا یہی رنگ رہا تو خیال ہے کل صبح ہی کھسک لوں گا"

"بالکل ٹھیک۔ کام بن گیا۔ بھئی قصہ یہ ہے کہ مسٹر دِس تک گریگر کو کل ہی واپس جانا ہے۔ نہیں پہنچانے کے لئے کوئی موٹر خالی نہیں ہے۔ اگر تم ہی یار میرے انہیں اپنی کار میں لیتے جاؤ تو کیا بات ہے۔ جُگ جُگ جیو۔"

انور اعظم ابھی کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ جگدیش پھر بولا "نو بس طے ہے۔ ہاں تم جم سے بھی مل لو۔ ماسٹر ِمک گریگر۔ کنور انور اعظم۔ اچھا بھئی شب بخیر" اور دوسرے لمحے وہ پنڈال سے نکلتے ہوئے مجمع میں کھو گیا۔

انور اعظم اپنے خیمے کی سمت جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت سر پڑ گئی۔ یہاں سے تو صبح صبح نکل جاؤں گا۔ لیکن لکھنؤ کی سڑکوں پر پہنچ کر لوگ کیا دیکھیں گے کہ انور اعظم صاحب ان لوگوں کو موٹر میں ساتھ لئے گھومتے ہیں میں جگدیش سے کہلوائے دیتا ہوں کہ بھائی تم کچھ اور انتظام کر لو۔ مجھے تو اس سعادت سے معاف ہی رکھیو۔

لیکن تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی اور وہ جگدیش سے کچھ نہ کہلوا پایا اور پھر اس کی کار دیوے شریف کی اس سوتی ہوئی دنیا کو پیچھے چھوڑتی لکھنؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ راستے بھر اس سے باتیں کرے گی۔ اس کا سگریٹ لائیٹر استعمال کرے گی۔ بہت ممکن ہے۔ فرلش بھی ہو جائے۔ بہت ممکن ہے اپنے فلیٹ پر پہنچ کر صبح کی چائے میں اسے شرکت کے لئے مدعو بھی کر لے۔ لیکن وہ خاموش رہی

ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اس نے اپنے بھورے بال جالی میں سمیٹ لئے اور پیروں پر کمبل ڈال کر تیزی سے گذر جانے والے درختوں اور کھیتوں کو دیکھتی رہی۔ جم راستے بھر چلتے چلتے انگریزی گانے گنگناتا اور سیٹیاں بجاتا رہا۔ بوڑھا مک گریگر اپنا چقندر ایسا منہ لئے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بے تحاشا موٹی مسز مک گریگر جسے فیل پا کی بیماری تھی۔ اپنی پتلی ٹانگ موٹی ٹانگ پر رکھے سگریٹ پر سگریٹ ختم کرتی رہی۔

"آپ کا گھر کس جگہ پر ہے؟" لکھنؤ میں داخل ہو کر مال پر پہنچنے کے بعد کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے پہلی بار انور نے بات کی۔ تب وہ خاندان اپنے اپنے خیالوں سے چونکا

"آیوتی کورٹ۔ بیر ورو ڈ" جم نے جلدی سے بتایا۔

لال باغ میں پہنچ کر ایک نئی وضع کی دو منزلہ عمارت کے آگے اس نے کار روک لی۔

"تھینکس ایور سو مچ" اٹیچی کیس اور کمبل سنبھال کر باہر کودتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔

"چیریو" جم ایک چھلانگ لگا کر برآمدے میں چڑھتے ہوئے چلایا۔

آخر میں وہ اتری۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ ٹن پاتھ پر پھینکا اور بے پروائی سے پرس اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

آس پاس فلیٹوں کی بالکنیوں میں شوخ رنگوں کے جاپانی ڈریسنگ گون اور تو لئے دھوپ میں پھیلائے جا رہے تھے اور ایک عمارت میں سے وائلن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

قمر آرا نے کہا "بابا ہم ہو لکھنؤ جائے کے پڑھبا"

چودہری اصغر علی خاموش رہے۔ قمر آرا کو لکھنؤ بھیجنے کے معنی تھے خرچ اور

زیادہ خرچ۔ ان کی ماہانہ آمدنی تین سو بھی نہیں پڑتی تھی اور اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کا خرچ اٹھانا بڑی ہمت کا کام تھا۔ لیکن قمر آرا اس وقت تخت کے کونے پر بیٹھی نہایت چپ چاپ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پتہ نہیں بابا جانے دیں گے یا نہیں۔ اس کی آنکھیں بھی خورشید کی آنکھوں کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ وہ بھی جب ان سے کوئی بات منوانا چاہتا تھا تو اسی طرح بھیگی بھیگی پلکیں جھپکاتا رہتا تھا۔ لیکن خورشید کو ان کی نظروں سے اوجھل ہوئے اب اتنے برس ہو گئے تھے اور قمر آرا اس وقت ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے گلابی دوپٹے کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور وہ ابھی ابھی آنگن کی دیوار کی کھڑکی پھلانگ کر کنور رانی کی حویلی سے واپس آئی تھی۔ اور بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب اس کی پلکیں آنسو گرانے پر آمادہ تھیں۔ کنور رانی اور ان کا خاندان دیوے شریف کے میلے کے بعد بارہ بنکی سے لکھنؤ واپس جانے کے بجائے چند روز کے لئے سیدھا مانا ٹھیر آ گیا تھا۔ قمر آرا بھی ان سب کے ساتھ اپنے گھر واپس آئی تھی اور رخشندہ بجیا کی تجویز پر لکھنؤ چل کر مسلم گرلز کالج میں داخل ہونے کی ہمت کر رہی تھی۔

کنور رانی سال بھر میں دو تین بار مانا ٹھیر ضرور آتی تھیں اور اس زمانے میں قصبے میں بے انتہا رونق ہو جاتی تھی۔ حویلی میں دن بھر آنے جانے والوں کا تانا بندھا رہتا تھا۔ ڈیوڑھیوں میں چوپہلے، پالکیاں اور ادّھے کھڑے رہتے۔ باہر دیوان خانے کے مکان میں کنور صاحب اور پی چو اور لو لو کے پاس لوگ جمع رہتے۔ باہر اور اندر صبح و شام بیسیوں آدمیوں کے لئے دسترخوان بچھتا۔ حویلی کے اندر میراثنیں اور نائنیں جمع رہتیں۔ رخشندہ کے کمرے میں برادری بھر کی لڑکیاں آ بیٹھتیں اور رات گئے

تک ڈھولک پٹتی۔ لوگ کچھ عرصے کے لئے بھول جاتے کہ کال اور لڑائیوں کا اور دکھوں کا زمانہ ہے۔ کرواہاراج والوں کی روایتی شان وشوکت اس چہل پہل سے کچھ عرصے کے لئے دوبارہ زندہ ہوجاتی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو لیتے کہ سونے کے جھولوں والے ہاتھی اور سر میلکم ہیلی کو ملکو میاں پکارنے والے بڑے کنور صاحب گو اب زندہ نہیں لیکن عفران منزل کی موٹروں پر کرواہاراج کے نام کے سفید چمکدار حرفوں والی سرخ پلیٹیں تو اب بھی موجود ہیں۔ انہیں فخر تھا کہ ان کے باپ دادا صدیوں سے جن آقاؤں کی زمینوں سے وابستہ تھے۔ وہ خود بھی اب تک ان ہی کے ساتھ ہیں۔ کرواہاراج کی طلسماتی روایتوں اور الف لیلوی داستانوں سے ان کا تعلق بھی رہا ہے۔ وہ پی چو بھیا اور رخشندہ بٹیا کے نام پر جان دیتے تھے۔ جب کرواہاراج کی موٹریں گھاگرا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی آکر ماناٹھبر میں رکتی تھیں تو وہ کھیتوں اور باغوں میں سے دوڑ دوڑ کر سڑک کے دونوں طرف آکھڑے ہوتے تھے اور "بندگی بھیا" "بندگی بٹیا" چلاتے تھے۔

"چودھرائن کے ہاں تو ابھی دربار لگا ہوگا۔ تم اتنی جلدی کیسے آگئیں"۔ چودھری اصغر علی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد تخت پر سے نیچے اتر کے جوتے تلاش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بابا ہم اس لئے آئے تھے کہ رخشندہ بجیا پرسوں تک لکھنؤ واپس جانے کو کہہ رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے کالج کی چھٹی ختم ہونے والی ہے۔ ان کے ساتھ اب کے ہم بھی چلے جاتے۔ بابا ہم ـــــ" پھر اس کی آواز رندھ گئی۔

آنگن کے چبوترے پر تلسی اور چنبیلی کی جھاڑیوں کے قریب نماز کی چوکی پر امان بیگم اب تک "تحفۃ العوام" کھولے بیٹھی تھیں۔ صنوبر املی کے درخت تک آگئی تھی اور

زوال کے وقت میں ایک دو گھڑی دن باقی تھا۔ لیکن جب سے خورشید گھر سے غائب ہوا تھا وہ پہروں اسی طرح نماز کی چوکی پر بیٹھی رہتی تھیں کہ ممکن ہے خورشید اب بھی لوٹ آوے۔ تہواروں کی راتوں میں محلے اور برادری کی لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک بجاتے بجاتے قمر آرا دفعتہً سوچنے لگتی۔ بھائی میاں کو یہ گیت اتنا پسند تھا۔ پھر اسے خیال آتا۔ شاید بھائی میاں اب بھی واپس آجائیں۔ لیکن خورشید کو گئے اتنا زمانہ نکل گیا تھا اور چودھری اصغر علی کی چھوٹی حویلی اسی طرح سنسان پڑی تھی اور اس کے بے رنگ دن یونہی گذرتے جا رہے تھے۔

اور اب کنور صاحب کی حویلی میں تین چار دن کے لئے رخشندہ بجیا آگئی تھیں ان کی ہر وقت شور مچانے والی سہیلیاں ان کے ساتھ تھیں اور وہ سب دن بھر گراموفون بجاتیں۔ دور دور کھیتوں کی سیر کو نکل جاتیں اور گھاگرا میں کشتی رانی کرتے کرتے فیض آباد کے گپتا رگھاٹ تک پہنچ جاتیں۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ اتنے اچھے دن تھے۔ قمر آرا بہت خوش تھی۔

دوپہر ہوگئی۔ بڑی حویلی کے باغ میں بارہ کا گجر بجا۔ کنور صاحب خاصے کے بعد دیوان خانے میں سے اٹھ کر آرام کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ رخشندہ اور ڈائمنڈ اور گنّی نیو تھیٹرز کے پرانے پرانے ریکارڈ جو انہوں نے دیوان خانے کی کسی الماری میں سے ڈھونڈ نکالے تھے۔ بجاتے بجاتے اکتا کر سہ پہر کی چاء کے وقت تک کے لئے سو گئیں۔ دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ گہرا ہوتا گیا۔ وہی سناٹا جو کہ داہا راج کے ہرے علاقوں کی پرسکون فضاؤں پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا۔ آم کے جھنڈ کے پرے گھاگرا بڑی آہستہ خرامی سے بہہ رہی تھی

ہزاروں برس سے اسی طرح بہتی آئی تھی۔ جب سیتا مہارانی اور رام چندر جی کے کنول ایسے پیروں نے اس کے ساحل کی ریت کو چھوا تھا۔ جب کرشن بھگوان اس کی لہروں میں گپت ہوئے تھے۔ جب نواب بہو بیگم کی کشتیاں اس کے پانی میں تیرتی تھیں۔ جب کروا ہا راج کے بجرے اس کی موجوں پر ڈولتے تھے۔ یہ سب مناظر اُس نے دیکھے تھے اور ہمالیہ کے رشیوں کی ایسی بے تعلقی سے یونہی بہتی رہی تھی۔ مانا ٹھیر کا ہرا بھرا قصبہ سینکڑوں برس سے اسی طرح اُس کے کنارے خوابیدہ تھا اور اپنے اس ابدی سکوت سے مطمئن اور قانع تھا۔ اُس کے آس پاس میلوں تک ہرے جنگل پھیلے تھے۔ جن میں شکار کے لئے ڈھیروں نیل گائیں اور بارہ سنگھے اور مرغابیاں ملتی تھیں اور ارہر اور گیہوں کے کھیت اور ایکھ کے جھنڈ تھے اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں۔ آبادی کے باہر ندی کنارے ٹیلے پر کروا ہا راج کے چودھریوں کے بزرگوں کی ایک بہت پرانی خانقاہ اور درگاہ کھڑی تھی جو سمرقند و بخارا سے گھوڑوں کی تجارت کرتے وہاں آئے تھے اور انہیں بیچ کر بستے تھے۔ اس کی بھوری اور شکستہ دیواروں کے گنبدوں میں سے اُگ کر پیپل کے پودے اور لمبی لمبی خودرو گھاس باہر کو جھک آئی تھی۔ آبادی کے وسط میں کنور صاحب کی حویلی تھی۔ اس کے ایک مکان کے صحن میں فصل پر غلّہ آ کر بھرا جاتا تھا اور اسی صحن کے دالان میں لالہ اقبال نرائن تخت پر بیٹھے بیٹھے دن بھر بستی کے چودھری کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور کنور صاحب کی مقدمے بازیوں کی کارروائی میں مشغول رہتے تھے اور پیچوان کے لئے لکھنؤ سے خمیرے کے پارسل منگوایا کرتے تھے۔ دالان کے سامنے آنگن کی کچی زمین میں ایک بہت بڑا نرازو نصب تھا جس میں

اناج کا وزن کیا جاتا تھا۔ وہ ترازو اتنا بڑا تھا کہ اس کے پلڑے میں سر آغا خاں آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

حویلی کے احاطے میں کھڑے ہوئے بڑے بڑے اصطبل اور مسجدیں اور امام باڑے اور حمام اور پرانے وقتوں کی جتنی چیزیں اب تک باقی رہ گئی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوتی جا رہی تھیں۔ پرانے حمام اور بھول بھلیاں اور تہ خانے جو رخشندہ اور پی جو اور پولو کے بچپن میں آنکھ مچولی کھیلنے کی بہترین جگہیں ثابت ہوتے تھے۔ اب ان کے گموں اور سیڑھیوں اور طاقوں میں جنگلی گھاس اور خود رو پودے اگ آئے تھے۔ اس وقت تک صرف ایک ہاتھی بچا تھا جو بارود خانے کے اجاڑ پھاٹک میں کھڑا کان ہلاتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں اگر ہاتھی لٹ بھی جائے تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ولایت جاتے وقت کنور صاحب نے اسے فروخت کرنا چاہا۔ لیکن اس بچارے بوڑھے ہاتھی کو کسی نے مفت میں بھی نہ پوچھا اور ایک روز وہ یوں ہی گنے اور امرود کھاتے کھاتے اور اپنی ننھی منی آنکھوں سے گذرے وقتوں کے خواب دیکھتے دیکھتے ختم ہو گیا۔

مانا ٹھیر کی آبادی میں ٹھاکروں اور کائستھوں کے محلے اور چودھریوں کی بستی شامل تھی اور سفید پوشوں اور شرفا کی آبادی سے ذرا آگے بڑھ کر حجاموں، قصابوں اور جولاہوں کے محلے تھے اور قصبے کے خاندانی نسابوں کے گھر تھے۔ یہ لوگ جو ذات کے بھاٹ تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ بستی کے دولتمند اور معزز سادات کی شادیوں میں مراسم نکاح کے وقت حاضرین کو خاندان کے نسب نامے پڑھ کر سنائیں۔ عجیب و غریب نسب ... حضرت آدم کے نام سے چل کر خاندان

رسالت ؐ کے سلسلے کو ناموں کی طویل فہرست میں سمیٹتے ہوئے فلاں ابن فلاں کے سپوت جائے یعنی نوشہ میاں کے اسم مبارک پر آ رکتے تھے۔ پھر آبادی کے سرے پر قصبے کی پاٹر دں کے خوبصورت دو منزلہ وسہ منزلہ مکانات تھے۔ ان لوگوں کے ہاں ان کی اپنی کھیتی باڑی ہوتی تھی اور ایک زمانہ تھا کہ شام کے وقت اپنے شان دار رنگ برنگے رتھوں اور ادھوں میں ٹھتے سے بیٹھ کر وہ ہوا خوری کے لئے نکلتی تھیں اور محرم، عید، بقرعید، ہولی اور دیوالی اور دوسرے تہواروں پر بڑی حویلی میں سلام کے لئے حاضر ہوا کرتی تھیں (آج بھی آپ اگر کسی پرانی قسم کی قصباتی شادی یا کسی اور تقریب کی مردانہ محفل میں تشریف لے جائیے تو آپ کو چند بہکتی، لہکتی خوانین کا تعارف اس طرح کروایا جائے گا۔ کہ یہ چھوٹے نواب صاحب کا شوق ہیں اور یہ بڑے بھیا صاحب یا منجھلے کنور صاحب کا شوق ہیں) ان مکانات کے علاوہ مانا کھیر کی سڑک کے شروع میں ایک بہت بڑی عمارت تھی جو پہلے کسی ہندو ٹھاکر یا زمیندار کی حویلی رہی ہوگی۔ لیکن اب اس میں شکر کا کارخانہ تھا۔ مشرقی اضلاع سے گنے کے ڈبے چھوٹی لائن پر لڑھکتی ہوئی ننھی منی مال گاڑیوں پر لد کر وہاں پہنچتے تھے اور راب اور کھانڈ اور شکر بنائی جاتی تھی۔ مانا کھیر بہت موڈرن ہوتا جاتا تھا۔ وہاں بجلی کی روشنی اور ریڈیو پہنچ چکا تھا ایک ٹاؤن ایریا کمیٹی تھی۔ دو ہسپتال تھے۔ ایک سرکاری اور ایک امریکن مشن کا۔ کمی مڈل سکول اور پاٹھ شالے تھے سینما ہاؤس کھولنے کی تجویز کی جا رہی تھی۔ سید افتخار کا پروپگنڈہ سنٹر اور اسمٰعیل سرکل قائم ہو چکا تھا۔

دھوپ ڈھلنے لگی۔ ہوا کا ایک خنک جھونکا انار کے پتوں کو سرسراتا ہوا گزر گیا۔

کی صحنچی میں آن گھسا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شال لپیٹ کر اُٹھ بیٹھی۔ شام کی چائے میں ابھی دیر تھی۔ اور گیتی اور ڈائمنڈ اور ماہ مہمان خانے کے کمرے میں خواب خرگوش میں مصروف تھیں۔ اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی کہ چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اور پھر کالج جانا ہے۔ کالج کے خیال پر اسے قمر آرا یاد آگئی۔ جو صبح اس سے کہہ رہی تھی کہ اگر وہ بھی اس کے ساتھ چلی چلے تو کتنا اچھا ہو۔

"اے عباسی خانم —" اس نے انگڑائی لے کر آواز دی۔

"ارے بٹیا جاگ گئیں — کیا چاء منگواؤں بٹیا۔" عباسی خانم نے اپنی پلنگڑی پر سے ہڑبڑا کر اُٹھتے ہوئے دالان میں سے پکارا۔

"نہیں عباسی خانم ذرا گل شبو کو چھوٹی حویلی بھیج کر قمر آرا سے کہلوا دیجئے کہ بٹیا بلاتی ہیں۔" اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے کاہلی سے جواب دیا۔

گل شبو اپنے پرانے کی گوٹ کے اودے غرارے کے پائنچے سنبھالتی ہوئی صحنچی میں سے کود کر چنبیلی کی کیاریاں پھلانگتی آن کی آن میں آنگن کی دیوار پر جا پہنچی اور کھڑکی میں جھانک کر چلائی — "کمر بٹیا — اے کمر بٹیا — چلئے آپ کو ہمری بٹیا بلاوت ہیں۔"

"اچھا چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" قمر آرا نے اپنے کمرے میں سے جواب دیا۔

بیگم اصغر علی نے دالان کے تخت پر لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر آنکھ کھولی۔

"اے واہ ری رخشندہ بٹیا —" انہوں نے سوچا۔ "بھن پری کہیں کی — گھر کا گھر دا کر دیا کنور رانی کی لاڈلی نے۔ کھا گئی میرے بیٹے کو۔ دماغ لوٹا دیا اس کا۔ بولا دیا میرے لال کو — جانے کون جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہو گا دُکھیا۔ اور اب

راجکماری کی شان دیکھئے کہ چلو بٹیا بلاتی ہیں۔" انہوں نے دھوپ سے بچنے کے لئے پھر دوپٹہ چہرے پہ ڈال لیا اور دیوار کی طرف کروٹ کرلی۔

قمر آرا نے جلدی جلدی بال سنوارے اور دوپٹہ کندھے پہ ڈال کر آنگن کی کھڑکی کی طرف بھاگ گئی۔

بیگم اصغر علی اسی طرح منہ لپیٹے پڑی رہیں۔ پھر ظہر کی نماز کے لئے اٹھ بیٹھیں سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے اور آنگن میں املی کا درخت ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا تھا۔

پو لو کار لے کر کسی کام سے لکھنؤ واپس جا چکا تھا۔ پی چو اپنی بہنوں کے ساتھ چائے پینے کے لئے دیوان خانے سے اندر آگیا تھا۔

"تم لوگ لکھنؤ کب جا رہی ہو؟" اس نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

"کل۔ کیوں کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟" رخشندہ نے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی قصہ یہ ہے کہ پولو کار لکھنؤ لے جا چکا ہے۔ تم سب کو ٹرین سے جانا پڑے گا۔"

"ٹرین سے؟ ہولی میکرل۔ بڑا مزا آئے گا۔" ڈائمنڈ نے اچھل کر کہا۔

"قمر آرا بیگم کیا تمہارے ساتھ جا دیں گی؟" پی چو نے پوچھا۔ سب قمر آرا کو دیکھنے لگے۔ اس کا رنگ جاڑوں کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں جو محرابوں کی جالی میں چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور گلابی ہو گیا۔

"انہوں نے چچا میاں سے کہا تو ہے۔" رخشندہ نے کہا۔ "تم اتنی دیر سے باہر بیٹھے کیا کر رہے تھے پی چو۔ ذرا پہلے آجاتے تو ہم لوگ ستانے کے بجائے برج کھیلتے"

"بھئی چودھری شمیم اپنا تازہ ترین سوٹ پہنے آئے بیٹھے تھے۔ ان سے سرکھپایا اب چھٹکارا ملا ہے۔"

"چودھری شمیم یہاں کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو فیض آباد میں تھے"۔ رخشندہ نے پوچھا

"ممی سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ جانتی نہیں ہو ممی کے بعید چہیتے بھائی بھتیجے ہیں۔ پھر بلکیجنت پی چو نے محسوس کیا کہ چودھری شمیم کا ذکر قمر آرا کو بہت ناگوار گذر رہا ہے۔ اس نے موضوع فوراً تبدیل کر دیا۔ "اچھا چلو برج کھیلیں"۔ قمر آرا برج نہیں جانتی تھی۔ اس کی دوسرا نظ کے لئے رخشندہ صحنچی میں بیٹھی رہی۔ پی چو اور دوسری لڑکیاں اندر جا کر کھیلنے میں مصروف ہو گئیں...

قمر آرا تخت کے کونے پر بیٹھی ریکارڈوں کا البم الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ اس کی جھکی ہوئی کالی پلکیں دیکھ کر دفعتہً رخشندہ کو بڑی تکلیف دہ شدت سے کوئی بہت پرانی بات یاد آ گئی۔ قمر آرا کی آنکھیں۔ خورشید کی آنکھیں متجسس، خوفزدہ وحشی کالی آنکھیں۔ ان آنکھوں نے کہا تھا۔ تم ہمیں بہت جلد بھول جاؤ گی۔ اس لئے زیادہ رنجیدہ نہ ہو۔ وہ زیادہ کیا ذرا بھی رنجیدہ نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ خورشید مدتوں سے غائب تھا۔ خورشید جو کانپور میں مزدوروں کے ساتھ رہتا تھا۔ مئی اور جون کی گرمیوں میں ٹین کے تپتے سائبانوں کے نیچے لیٹتا تھا۔ نل کا گرم پانی پیتا تھا اور ترقی پسند شاعری کرتا تھا جسے پی چو اور ریو لو میرآجی کے "کالے کلموتے کتے" اسکول کی شاعری کہا کرتے تھے۔ وہ سب خوب ہی اس پر ہنستے تھے۔ انڈر گراؤنڈ ہونے سے پہلے وہ عرصے تک پچیس روپے ماہوار پر جو اسے پارٹی کی طرف سے ملتے تھے بمبئی جیسی جگہ میں گذر کرتا رہا تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار تو رخشندہ کے شوفر کی تنخواہ تھی۔

محمود رشید — خورشید — اس کے پاس اس کے اپنے کپڑے کبھی نہ ہوتے تھے کبھی نے کوٹ دے دیا وہ پہن لیا۔ کسی کا کمبل یا شال اوڑھ لی۔ کسی کی چادر لپیٹ لی اور کامریڈ خورشید غفران منزل چلے آرہے ہیں۔ اپنی ذاتی ضروریات سے زیادہ جو چیز بھی اس کے پاس ہوتی وہ فوراً پارٹی کے دوسرے ساتھیوں کو دے دی جاتی۔ وہ بچوں کی طرح ہنس پڑتا تھا اور اپنے حلقے میں بہت مقبول تھا۔ لمبی سی سرخ رنگ کی لاری میں جس پر سرخ جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ وہ اکثر.... محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے رفیقوں کے ساتھ جانے کا ہے میں مصروف گھومتا نظر آتا تھا۔ اس کے یہ بوہیمین انداز اور یہ حرکتیں رخشندہ کو بہت دلچسپ معلوم ہوئیں رخشندہ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ بھئی خاندان میں ہر قسم کی مخلوق ہونی چاہیئے۔ مثلاً خورشید میاں ہمارے گھر کے قومی ہیرو نمبر وَن۔ اس کے اور غفران منزل والوں کے سیاسی خیالات میں بڑا زبردست اختلاف تھا۔ وہ پہروں ان بہن بھائیوں کے ساتھ الجھتا رہتا اور وہ اس کی ہر بات مذاق میں اڑا دیتے اور آخر میں اسے اپنے ہمراہ جم خانہ یا دلکشا کلب لے جانے کی دعوت دے دیتے۔ "کہو بھئی تمہارے وطن روس کی حکومتِ عامّہ کیا کہتی ہے —" بی چُو بات شروع کرتا۔ "اماں کا کیا ذکر تھا؟" پوتُو بیچ میں کود پڑتا۔ "پوتُو بیچارے خورشید کو تنگ نہ کرو۔" رخشندہ ڈانٹتی "ارے تم زوال پذیر زمیندار لوگ۔ کیا کہا کہ ہمیں تنگ کرو گے۔" وہ بچوں کی طرح ہنس کر کہتا۔ کہا جاتا تھا جس روز .... وہ غائب ہوا۔ وہ دس بجے رات کو غفران منزل آیا۔ رخشندہ کالج کا کام ختم کرنے کے بعد لیمپ بجھا کر سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس کے ڈریسنگ روم کا پچھلا دروازہ کھلا اور رہوا کے ایک

تیز جھونکے کے ساتھ وہ دفعتہً اندر آ گیا۔ اس کے گھنگھریالے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور اس کی کالی آنکھوں سے لگتا تھا۔ وہ کئی راتوں کا جگا ہوا ہے۔ وہ چند لحظوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ رخشندہ پریشان ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہ اس کے سامنے آ گیا اور بڑی عجیب آواز میں کہنے لگا ــ" رخشندہ تم ــ تم بلی ہو" ــ رخشندہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔" افوہ۔ صرف یہ اطلاع دینے کو تم اس وقت ہمارے کمرے میں آئے ہو۔ چلو کھانا کھالو۔" اس نے عباسی خانم کو آواز دینی چاہی۔ لیکن خورشید نے پھر اسی انداز سے دہرایا۔" تم بلی ہو ــ بلی ہو ــ سمجھیں" ــ" افوہ کتنی پٹی ہوئی تشبیہہ دی ہے۔ تم تو جدید شاعری کرتے ہو۔ بھائی کوئی نئی بات کہی ہوتی۔" لیکن وہ بہت خوفزدہ تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ پھر چیخا ــ" رخشندہ بیگم اب تم میرا انداق نہیں اڑا سکتیں۔" خورشید رخشندہ نے اسے چپ کرانا چاہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ــــ واقعی اس کا دماغ چل گیا ہے۔ بیچارہ خورشید۔ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔" میں تمہیں مار ڈالوں گا جان سے تم سب کو۔ غفران منزل کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ کرداہا راج تباہ ہو جائے گا کرداہا راج کس کا؟ کسانوں کا۔ غفران منزل کس کی؟ مزدوروں کی ــ انقلاب زندہ باد" ــ" پی جو" ــ رخشندہ چلائی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ ریوالور نکالے گا۔ کرسیاں اٹھا کر اس پر پھینکے گا۔ کوئی اور اسی قسم کی حرکت کرے گا۔ پھر پولیس آئے گی۔ اخباروں میں قصے چھپیں گے۔ رپورٹر آن پہنچیں گے۔ ایک لحظے میں یہ ساری باتیں اس کے دماغ میں آئیں۔ اس نے پھر پی جو کو آواز دی۔" اس طرح مت چیخو۔ جیسے کوئی دیوانہ تمہارے کمرے میں آ گھسا ہے۔ نوکروں کو مت بلاؤ۔ اگر تم خود مجھ سے کہہ دو کہ چلے جاؤ تو میں چلا جاؤں گا۔ کبھی یہاں نہ آؤں گا۔" اس نے یکلخت سنبھل کر کہا۔" خورشید باہر جاؤ۔ اسی

وقت نکلو۔ چلو باہر" رخشندہ نے دیوار کی طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ دوسرے لمحے وہ دفعتہً بالکل خاموش ہو کر آہستہ سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر اماوس کی رات کی مکمل تاریکی تھی اور ہوائیں یوکلپٹس کے درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

اس وقت قمر آرا کو چپ چاپ اپنی کالی پلکیں جھپکاتا دیکھ کر دفعتہً اسے یہ سب پرانی، حماقت انگیز باتیں یاد آئیں۔ بچارہ خورشید۔ جانے آج کل کس چکر میں پھرتا ہوگا اُس نے بڑی ہمدردی سے دل میں سوچا۔

'کٹ تھروٹ' سے اکتا کر پی چو نے رخشندہ کو آواز دی۔" ارے بھئی روشی تم بھی آؤ۔ چلو قمر آرا بیگم کو بھی کھیلنا سکھا دیں۔"

وہ سب کھانے کے وقت تک کے لئے برج میں مشغول ہو گئے۔

پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ کھانے کے انتظام سے چھٹی پا کر عباسی خانم آنگن کے پرے اپنے ڈبرے کی صحنچی میں دوسری مغلانیوں اور خواصوں کے ساتھ آ بیٹھیں ڈلی کاٹی جانے لگی۔

"کل شبو کہت رہی چھوٹی حویلی والی بٹیا ہو نکھلؤ جائے کا چاہت ہیں"۔ شعلہ پری نے زردہ پھانکتے ہوئے اس روز کا اہم ترین موضوع سخن چھیڑا۔ سب عباسی خانم کی طرف بیحد اشتیاق اور عقیدت سے متوجہ ہو گئیں۔ تاکہ وہ اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور اس سے متعلق دوسرے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماویں۔

عباسی خانم پچھلے تین روز سے، جب سے وہ بارہ بنکی سے مانا کھیر آئی تھیں۔ یہ غور کر رہی تھیں کہ رخشندہ بٹیا نے تو قمر بٹیا سے اتنی دوستی کر رکھی ہے۔ لیکن کنورانی ایکو بار بھی کھڑکی پار کر کے چھوٹی حویلی والی بیگم سے ملنے نہیں گئیں۔ نہ وہ خود ہی یہاں

آئیں تھے۔ ہائے کیا زمانہ آلگا ہے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "چھوٹی حویلی والوں پر گھٹتی کا پھیر ہے۔ کوئی ان کا ساتھی نہیں۔ کہاں کے رشتے کہاں کی عزیز داری۔ ایک رخشندہ بٹیا فوری ہنس کر بات کر لیتی ہیں تو قمر بٹیا کیسی دوڑ دوڑ کر ان سے ملنے آتی ہیں، ایک اگلے زمانے کی محبتیں اور اخلاص تھا۔ کیا آغا اور کیا خادم۔ کیا بھائی بھائی اور کیسا رشتے دار سب ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عباسی خانم کی اس زمانے میں نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سسرال کے گاؤں روشن آباد میں تھیں۔ عباسی خانم کے میاں آدھی رات کو چل کے روشن آباد کے موضع سے جو علی گنج سے آگے ہے۔ جس کے راستے میں اب ازابلا تھوبرن کالج کی نو آبادی ہے۔ گومتی پار کر کے صبح ہوتے ہوتے غفران منزل پہنچتے تھے تاکہ صبح صبح بڑے کنور صاحب مرحوم کی دوائیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ناشتے کے وقت تک دے سکیں۔ ایک بار جب بڑی بہیا آئی ہے اور گومتی کا کاٹھ کا پل ٹوٹا ہے تو وہ مولا انہیں جنت نصیب کرے۔ پانی میں پیر کر غفران منزل پہنچے تھے۔ لیکن کام میں دیر نہ ہونے دی تھی۔ کنور صاحب خلد آشیانی نے بیسیوں مرتبہ کہا کہ آغا چھمن کیوں بیکار میں اتنی دردسری کرتے ہو کہ صبح سویرے اتنے کوس پیدل چل کر فرض کر کے آتے ہو۔ تمہاری دلہن جب تک روشن آباد سے غفران منزل نہ آویں۔ تم بھی ذرا دیر کر کے آیا کرو تو انہوں نے دست بستہ عرض کی تھی۔ سرکار مجھے آپ کی دواؤں کے معاملے میں کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ اب بھی دیکھ لو (عباسی خانم نے کہا) انہیں قمر بٹیا کے پردادا رخشندہ بٹیا کے پردادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی گذارے دار رہتے اور لوڈھی ہو گئے تھے۔ کمپنی بہادر کی سرکار کی آنکھوں کا تارا تھے۔ شان سے صاحب لوگ کے ساتھ شکاری

کتے لئے دولدوں پر گھومتے تھے اور کلکتے جا کر مبہم لوگ کے سامنے کالا پانی پیتے تھے۔
جب تباہی مچی ہے تو اس وقت رخشندہ بٹیا کے پردادا نے قلم اٹھا کر معافی کی جتنی
جاگیریں اور پٹی داری کے جتنے علاقے ترائی تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان سب کے نام
فہرست سے کاٹنے شروع کر دیئے کہ بُرا زمانہ آ لگا ہے۔ جانے کل تک کیا سے کیا
ہو جاوے۔ اتنی بڑی ریاست رکھ کر کیا کریں گے۔ گذارے بھر کے خیال سے سوا ڈیڑھ
سو گاؤں رکھ لئے اور اس سے پہلے کہ فرنگی کا پروانہ آن پہنچے۔ اپنی عزت بچانے
کے خیال سے باقی سب خود ہی کمپنی بہادر سے کہہ دیا کہ بھائی شوق سے ضبط کر لو
اس پر بھی جب فرنگیوں نے لکھنؤ میں بیگمات کے محلوں کا محاصرہ کیا ہے اور نواب
کے نہتے وفادار اپنی جان لڑا کر چھتر منزل کی بیگمات کی حفاظت میں لگے ہیں۔ اس وقت
دشمنوں نے خبر کر دی کہ کروا ہار راج کے کنور صاحب جان عالم سے ملے ہوئے
ہیں۔ کنور صاحب بڑے جری آدمی تھے۔ انہوں نے حویلی میں پورا پورا انتظام کر رکھا
تھا۔ بندوقیں اور بھائی میرے اس کا نام لیجئے۔ فلیتے اور گولہ بارود سبھی کچھ تھا۔ اب
ادھر کی سنو کہ چھوٹے بھائی جو تھے۔ قمر بٹیا کے پردادا، وہ بڑی مستعدی سے انگریزوں
کی مدد کر رہے تھے۔ ۵۶ء میں جب سلطان عالم اور ان کے خاندان والے مٹیا برج
گئے ہیں اور اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے تو اس کے کچھ روز بعد ہی کلکتے کی
بڑی عدالت نے حکم دیا کہ کروا ہار راج کے کنور صاحب کو بغاوت کے جرم میں تو
بیلی گارد میں بند پلٹنی کی توپ کے منہ سے باندھ کر گولی سے اڑا دیا جاوے اور چھوٹے
کنور صاحب کو وفاداری کے صلے میں گھاگرا کنارے کی ساری معافی کی زمینیں
بحال کر دی جاویں۔ ذری سوچیئے کہ حالانکہ دونوں بھائیوں میں کتنی بڑی دشمناگی تھی اور

مدتوں سے ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھی تھی۔ لیکن موقع پر خون نے جوش مارا اور چھوٹے کنور صاحب نے صاحب گورنر بہادر سے عرض کی کہ حضور میری جاگیریں اور انعام اکرام سب مجھ سے واپس لے لیجئے۔ فقط بھائی صاحب کی جاں بخشی کردی جاوے اس زمانے کا فرنگی بھی بڑا شریف ہوتا تھا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ کنور صاحب کی جان بخشی کی جائے۔ سب زمینیں بھی انہیں واپس مل گئیں اور کروا ہا راج کی شان چھوٹے بھائی کی قربانی کی وجہ سے ویسی ہی قائم رہی۔ ایک وہ زمانے تھے اور اب کوئی جانتا بھی نہیں کہ چھوٹی حویلی والوں نے ان کے لئے کیا کیا تھا۔ چھوٹی حویلی والوں کے پاس اب کچھ نہ رہا تھا۔ ان کے علاقے قحط زدہ تھے۔ ان کی فصلیں خراب رہتی تھیں۔ ان کی رعایا جس میں زیادہ تر جنگجو ٹھاکر تھے، ان کے بس کی نہ تھی۔ ان کا اکلوتا لڑکا گھر سے بھاگ گیا تھا۔

عباسی خانم یہ قصہ پہلے بھی بیسیوں مرتبہ سنا چکی تھیں۔

لیکن قمر آرا کو ان باتوں سے کچھ مطلب نہ تھا۔ اس نے ان قصوں پر کبھی دھیان نہ دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف یہ سوچا کرتی تھی کہ رخشندہ بجیا نے ایسے کون سے ثواب کمائے ہیں جو دنیا کی نعمتیں انہیں حاصل ہیں اور اس وقت رات کے کھانے کے بعد بڑی حویلی سے واپس آکر اسے پتہ چلا تھا کہ بابا ابھی اسے لکھنؤ نہیں بھیج سکتے۔ لکھنؤ کا مسلم گرلز کالج کہیں بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ رخشندہ بجیا دوسرے روز صبح ہی صبح لکھنؤ روانہ ہونے والی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب خوب روئے آخر وہ ہی ایسی بدقسمت کیوں تھی اور ایک چودھری شمیم تھے جو اس طرح اس سے شادی کرنے کو تلے بیٹھے تھے۔ گویا بنسی لئے مچھلی کا شکار فرمانے ہیں۔ صرف کانٹا حلق میں پھنسنے

کی دیر ہے۔

دالان کے پردے گرا کر وہ اپنی مسہری پر جا گری اور کچھ دیر بعد سو گئی۔

پھر گھاگرا کے ساحلوں پر سے گذرتا، لیموں کی ڈالیوں کو ہلاتا جاڑوں کی صبح کا ٹھنڈا جھونکا سہ دری کے شیشوں سے آ ٹکرایا اور گیتی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، چار بج رہے تھے۔ ارے بھئی اٹھو مہیم لوگ۔ اس نے آواز دی۔ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ مہریوں نے جلدی جلدی غسلخانوں میں گرم پانی رکھا۔ اسباب لالہ اقبال نرائن کی نگرانی میں دیوانخانے میں پہنچایا گیا۔ کنور رانی کے کمرے میں جمع ہو کر انہوں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ پی چو نیلے رنگ کا گرم ڈریسنگ گاؤن پہنے سگریٹ کا دھواں رخشندہ کے چہرے پر چھوڑتا اپنی بہنوں کو سوار کروانے کے لئے دیوانخانے کے بڑے پھاٹک تک آیا۔ اسٹیشن تک موٹر کی سڑک نہیں تھی۔ اس لئے ریل پر جانے کے لئے بہلی یا ادھے کی سواری کی جاتی تھی۔ شالوں اور کمبلوں میں لپٹ کر وہ سب بہلی میں جا بیٹھیں۔ اس کے سرخ پردے جن پر سفید کٹاؤ کا کام بنا تھا۔ چاروں طرف گرا دیئے گئے۔ لالہ اقبال نرائن چند سپاہیوں کے ساتھ آگے بیٹھ گئے اور ٹن ٹن کرتی بہلی چل پڑی اور کروا ہا رہ اج کی حویلی اور مانا ٹھیر کے خوابیدہ پرسکون قصبے اور آم کے باغات کو اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی کچی سڑک پر دوڑنے لگی۔

کہر آلود دھندلکے میں مانا ٹھیر کا اسٹیشن دور سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی دیو نے ان ہرے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھروندا کہیں سے لا کر وہاں رکھ دیا ہے۔ پھر چھوٹی لائن پر اٹھلاتی، شور مچاتی ننھی منی سی ٹرین آ کر دو تین منٹ کے لئے رک جاتی لالہ وو ڑبھاگ مچا کر بے حد انتظام سے بیگمات کو سوار کرواتے اور ہرے کھیتوں اور

جنگلوں میں سے گذرتی گھاگرا کو عبور کرتی ہوئی وہ ٹرین پھر شہروں کی طرف چل پڑتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ لالہ ہانپتے کانپتے گارڈ کے پاس پہنچتے "اے قبلہ گارڈ صاحب اک ذری دو منٹ اور ٹھہر جائیے گا۔ کرواہا راج کی سواریاں تشریف لائی ہیں" اور ٹرین مزے سے کھڑی رہتی۔ بالکل گھریلو معاملہ لگتا۔ ایک خوبصورت لطیفہ یہ تھا کہ لالہ کا کنور رانی اور رخشندہ اور دوسری بیگیات سے کرواہا راج میں اوفیشیل قسم کا پردہ رہتا تھا۔ لالہ کے دادا پردادا پشتوں سے کرواہا راج میں مختار عام رہے تھے، پرانی وضعداریوں کو نبھاتا تھا۔ ورنہ لالہ خوب دیکھتے تھے کہ شہر میں پردہ تو دور کی چیز ہے بٹیا سڑکوں پر سائیکلوں تک پہ گھومتی ہیں۔

دوسری ریل آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ آسمان کے مدھم ستاروں کے نیچے سنسان پلیٹ فارم کے ایک کنارے پر سوٹ کیس ایک طرف رکھے لیمپ کے کھمبے سے ٹیک لگائے وہ دیر سے کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ اکتا کر ایک آدمی کو جو سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس نے آواز دی "ارے بھئی یہاں تانگہ وانگہ نہیں ملتا کیا؟"

"تانگہ نہیں صاحب یہاں بہلی چلتی ہے۔ یا چاہے اکہ لے لیجئے۔ کہاں جائیے گا چودھریوں کی بستی یا ٹھاکروں کی؟" اس آدمی نے کمبل کا بکل مار کے مزے سے چلم کریدتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس نے قریب سے گذرتے ہوئے لالہ اقبال نرائن کو پکارا۔ "لو بھئی لالہ ای صاحب بہادر جان پڑت ہے۔ تمہرے ہیاں جائے کا چاہت ہیں۔ اپنے لگے ہی بٹھلائے لئے جاؤ۔" یہ فیصلہ کر کے وہ ناریل کے کش بھرتا پٹڑیوں کو پھلانگ کر کہر کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

وہ انتہائی اکتاہٹ اور بیزاری کے ساتھ کھمبے کے پرے ٹہلنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر کی کھڑکی کے آگے مال گودام کے ایک اونچے سیاہ صندوق پر بیٹھی موٹی لڑکیوں نے کھسر پھسر شروع کر دی "ہولی اسموک۔ کتنا ہینڈسم آدمی ہے"۔ "بالکل جمیں میسن کا بھائی"۔ ارے چپ۔ تو لالہ سن لیں گے"۔ "لالہ پوچھتے کا ہے نہیں۔ کیا پی جو سے ملنا چاہتے ہیں آپ "۔

لالہ کھنکارتے ہوئے بے حد اہتمام سے آگے بڑھے۔ "تسلیمات عرض کرتا ہوں جناب کہاں تشریف لے جائیے گا۔ مہلی حاضر ہے۔ بندہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ جناب کروا ہاراج کے کنور صاحب سے ملاقات کا قصد رکھتے ہیں یا ـــ"

ٹرین آگئی اور لالہ اپنی تمہید چھوڑ چھاڑ کر ہڑبڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

وہ سب بہت تھکے ہارے زعفران منزل واپس پہنچے۔ کالج کی ایک ہفتے کی چھٹی ختم ہونے والی تھی اور ڈائمنڈ، گیتی اور اوما زعفران منزل سے اپنے اپنے گھروں کو جانے کی فکر میں تھیں۔ وہ سب ہمیشہ کی طرح بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ انہوں نے راستے میں چلا چلا کر گیت گائے تھے۔ چنے کے کھیتوں کو روندا تھا۔ گھاگرا کی لہروں میں مچھلیاں پکڑی تھیں اور اب وہ پی جو کے سٹنگ روم میں سہ پہر کی چائے کی منتظر تھیں۔

اس تیز گام زندگی میں جس کا ہر لمحہ ہمیں اس زناٹے سے مستقبل کی ان دیکھی اندھیری وادیوں کی طرف دھکیلتا آگے نکل جاتا ہے۔ ایسے وقتوں کی جنھوں نے ہمیں تھوڑی سی دیر کے لئے بھی مسرت بخشی اور ایسے ساتھیوں کی جو ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہمارے شریک رہے ہمیں قدر کرنی چاہئے۔ جی چاہتا ہے ان ساری نعمتوں کے لئے تہ دل

سے خدائے قدوس کا شکر ادا کیجئے۔

تو گویا یہ یوں ہے۔ نیو آیسا کے نئے پرچے کے کنارے پر بے ربط سطریں لکھتے لکھتے اور پکاسو کی قسم کی تصویریں بناتے بناتے اکتا کر رخشندہ نے کشن پر سر رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ اب کیا کروں۔ موڈرن آرٹ میں یہ ہے کہ جتنی بھی آڑی ترچھی لکیریں آپ کھینچئے گا اتنا ہی زیادہ موڈرن آرٹ ہو گا۔ نہایت شوخ رنگوں سے کاغذ کی سطح پر ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے پھندنے بنا دیجئے اور رنگ کے دھبوں کو خلط ملط کرنے کے بعد فن کے نقادوں کو ان میں انتہائی گہرے معنی تلاش کرنے کے لئے چھوڑ دیجئے اور یہ جو برن جونز اور روزٹی ٹرنر اور کانسٹبل تھے۔ یہ سب بیوقوف تھے۔ رخشندہ کو اس وقت خیال آیا بھئی واہ۔ زندگیوں کا چکر ہے کہ چلے جا رہا ہے۔ اس ہی جانے کتنے دل ٹوٹیں گے کتنی مایوسیاں اُٹھانی پڑیں گی کتنے انقلاب آئیں گے۔ پچھلا ہفتہ بارہ بنکی اور فیض آباد میں کس قدر دلچسپی کا گذرا۔ وہ دور دور تک جنگل کی پگڈنڈیوں پر گھومی "گلیمر لو اٹنے والے ایڈونچر پہ قہقہے لگائے۔ میوزک کانفرنس کی تنقیدیں کیں۔ بیل گاڑیوں پر چڑھ کر گنے کھائے اور اب یہاں پھر وہی پرانی زندگی شروع ہو جائے گی۔ کالج کی دوپہریں دلکشا کلب کی شامیں۔ زندگی فی الحال بڑی بھرپور تھی۔ بڑی مکمل۔ وہ ان لمحوں کے لئے خدائے قدوس کی شکر گذار تھی۔ کیوں نہیں دنیا میں سب لوگ اسی طرح بشاش رہتے لیکن دفعتہً اس کے من ہی جانے کہاں چھپے ہوئے ایک سچ نے اچک کر چپکے سے کہا رخشندہ بیگم یہ غلط ہے۔ تم کبھی بھی خوش نہیں رہیں۔ تم تو ہمیشہ اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی ہو۔ تم زندگی سے فارغ تو کبھی بھی نہیں ہو ئیں کمبخت۔" رخشندہ نے اپنا خوبصورت سر ہلا کر کہنا چاہا —

گنتی کمرے کے سرے پر جلدی جلدی نئی انگریزی کتابوں پر وہ تبصرہ مکمل کر رہی تھی جو وہ پچھلے ہفتے رخشندہ کے ساتھ لکھنؤ سے باہر چلے جانے کی وجہ سے اب تک لکھ کر براڈ کاسٹ کے لئے ڈِل کو نہ دے سکی تھی۔ ڈائمنڈ رخشندہ کے پیانو پر وہ گیت بجانے کی کوشش کر رہی تھی جو اس نے پچھلے ہفتے میوزک کانفرنس میں طلعت محمود سے سنا تھا۔ پی جو کا سب شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

رخشندہ بہت دنوں بعد ایک دم پھر سے رنجیدہ ہوگئی۔ انسان کی موڈ بھی کیا کرامتیں کرتی ہے۔

باہر ڈرائیو پر ایک کار آکر رکی۔ ایک بالکل اجنبی ہارن بجا اور بجری پر کسی کے بوٹوں کی رگڑ کی آواز آئی۔

"کون آیا ہے جنے۔ گنتی ڈارلنگ تم دروازے کے قریب بیٹھی ہو۔ ذرا دیکھنا تو سہی" رخشندہ نے کاہلی سے کہا۔

"ارے روشی ڈارلنگ ذرا تم ہی اٹھ کر دیکھ لو۔ میرے دماغ میں اس قدر بہترین جملہ ایک آیا ہے۔ وہ نکل جائے گا۔ گنتی پھر کاغذوں پر جھک گئی اور لکھنے لگی" اسٹین بک کے فن کی عظمت۔۔۔"

رخشندہ اکتاہٹ کے ساتھ اٹھی اور کمرے کی لمبان طے کر کے باہر برآمدے میں آئی۔ اور ریلنگ پر جھک کر اس نے دیکھا کہ وہ سانولا، انوکھا، مغرور، سیاہ آنکھوں اور لمبی پلکوں والا اجنبی اس کے سامنے کھڑا بڑی بے نیازی سے چاروں طرف دیکھ کر شاید کسی نوکر کو آواز دینے والا ہے۔

اوہ — یہ دہی ہے۔ یہ دہی ہے۔ یہ دہی ہے۔

وہ تو اسے جانتی تھی۔ اسے ہمیشہ سے معلوم تھا۔ وہ کبھی نہ کبھی آئے گا۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اس سے دوبارہ ملے گا۔ صوبے کے گزٹ میں دو تین روز ہوئے اس نے اس کا نام بھی دیکھا تھا۔

"اوہ"۔ رخشندہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اوہ"۔ اس نے اتنا ہی مختصر سا گویا اسے جواب دیا۔

"آپ ڈاکٹر سلیم ہیں"۔ رخشندہ نے سیڑھیوں پر آکر اسے اطلاع دی۔

"جی۔ اوپر آجاؤں؟"

"ضرور۔ پی چو باہر گیا ہوا ہے۔ ابھی آتا ہوگا"۔

"۔۔۔؟"

"پی چو میرا بھائی ہے"۔

"جی۔ اور یہ غفران منزل ۲۴ اوٹرم روڈ لکھنؤ ہے"۔ اس نے اسی لہجے میں کہا رخشندہ کو باوجودیکہ اس وقت وہ اتنی رنجیدہ تھی ہنسی آگئی۔ "اندر تشریف لے آئیے" اس نے ریلنگ پر سے اترتے ہوئے کہا۔

وہ سٹنگ روم میں آکر چپ چاپ ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

گنی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگئی۔

ڈائمنڈ طلعت محمود کا گیت بجاتا رہی۔

رخشندہ نے پکاسو پر پھر سے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

چند منٹ اسی طرح گذر گئے۔ وہ خاموشی سے دریچے کے باہر مولسری کے درختوں کو دیکھتا رہا۔

پھر زناٹے سے ایک موٹر سائیکل باہر آکر رکی اور کرن اندر آیا۔

"ہلو کرن" گنی نے کاغذوں پر سے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"ہلو کرن" ڈائمنڈ پردوں پر زور سے انگلیاں مار کر بولی۔

"ہلو کرن" رخشندہ نے بیحد مری ہوئی آواز میں کہا۔

"پی جو کیوں نہیں آیا؟ کورس ہوا۔ پھر سب چپ ہو گئے۔

کرن چند لمحوں تک بغیر جواب دیئے ہونٹوں سے اپنا نارنجی پائپ لٹکائے کھڑا رہا۔

"ثابت ہوا کہ تم لوگ ایک ہفتے تک جنگلوں کی ہوا کھاتے کھاتے بالکل جنگلی بلیاں بن گئی ہو۔ روشی کیا تم ان بزرگوار کو نہیں جانتیں" اس نے پوچھا۔

"ہم۔ اوفیشیل طور پر تو نہیں" رخشندہ نے جواب دیا۔

"ملو بھئی میجر سلیم۔ کرداہا راج کی رخشندہ بیگم"

"آداب عرض"

"تسلیمات"

"ارے ہائے" ڈائمنڈ دفعتہً چلائی۔

"ارے بھئی واہ" گنی نے کاغذ ایک طرف کو پھینک دیئے اور موقع کی سخت ڈرامائی اہمیت پوری طرح تب اس کی سمجھ میں آسکی۔ جان اسٹین بک اور رہا سہم اپنی جان بچا کر سرپٹ نکل بھاگے۔

"ارے وہ۔۔۔ روشی وہ اسٹیشن والا سوپر ڈیشر اسمیشر" ڈائمنڈ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔

"بھئی واللہ کیا چیز ہوئی ہے۔ بیٹھو کرن۔ تشریف رکھئے آپ بھی"۔ رخشندہ نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔ اس کی شگفتگی پھر واپس آ گئی۔ "واللہ کمال ہو گیا"۔ وہ بولی۔

کرن دریچے میں جا بیٹھا۔ غریب کو شوک پہنچ رہا ہو گا سلیم۔ "یہ میڈ ہیٹرز پارٹی میں تمہارا پہلا دن ہے۔ رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے"۔

"ارے آپ کل صبح مانا ٹھیر کے اسٹیشن پر کیا کر رہے تھے بھائی"۔ رخشندہ نے پوچھا۔

"جھک مار رہے تھے"۔ کرن نے جواب دیا۔

"کس سلسلے میں؟"

"تم تینوں بہن بھائی اتنے خبطی ہو۔ بھائی صاحبان تمہارے تم سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ اس نے پی جو کو اطلاع دی تھی کہ اس کا تبادلہ ایک دم پرتاپ گڑھ جیسے نفیس مقام کا ہو گیا ہے۔ وہ راستے میں تم سب سے ملتا جائے گا آپ کے بھائی صاحب بلند اقبال جانے کس چکر میں تھے کہ اسٹیشن پر پہنچے ہی نہیں اور اسے دوسری ٹرین سے لکھنؤ واپس آنا پڑا"۔

"سچ سچ۔ پی جو تو ہیں بے وقوف۔ آپ اگر مانا ٹھیر پہنچ گئے ہوتے تو ہم آپ کو مرغابیوں کے شکار کے لئے لے جاتے"۔ رخشندہ نے افسوس ظاہر کیا

"اور گنے کھلاتے آپ کو"۔ ڈائمنڈ نے کہا

"لیکن ہم تو خود ہی کل لکھنؤ آ رہے تھے"۔ گنی بولی

"تو جناب آپ کو اس سے پہلے آ جانا چاہئے تھا"۔ رخشندہ نے کہا۔

"مگر پی چو نے تو کبھی آپ کا ذکر ہی نہیں کیا" گنی نے کہا۔

"اب بھی کوئی اہم بات ہوتی تو اس کا ذکر بھی کیا جاتا" ڈائمنڈ بولی۔

"جی نہیں اگر لوگ اہم ہوتے تو ان سے ذکر کیا جاتا۔ اب ہر چیز کی اطلاع آپ لوگوں کو دی جائے۔ یہ اچھی مصیبت ہے" کرن نے کہا۔

"ارے بھئی یہاں تو حکومت عامہ شروع ہو گئی۔ وہ شور قیامت اٹھا ہے کہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈوک آ گیا" پی چو نے حسب معمول ڈیسک میں سے کودتے ہوئے کہا۔

"کون آ گیا؟" رخشندہ نے آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

"ارے ابھی تم لوگوں کو کرن نے ڈوک سے ملوایا یا نہیں بھئی یہ نہایت ہی تاریخی ہستی ہیں مولانا سلیم۔ ایک زمانہ تھا کہ خاکسار کے ساتھ الٰہ آباد میں بی۔ اے۔ سی فرماتے تھے۔ اب سول سرجن بنا کر اس بدقسمت ملک کو نوازنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہم اولیاؤں کو پچھلے مہینے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملٹری سے سول میں تبدیل ہو کر تشریف لا رہے ہیں گو آپ نے اطلاع اب آن کر دی۔ لہٰذا یہ فدوی بر وقت اسٹیشن پہ حاضر نہ ہو سکا" پی چو نے تعارفی تقریر ختم کر کے چاروں طرف دیکھا اور کہا "اب تالیاں بجاؤ"۔ تالیاں بجیں۔

"ظاہر ہے کہ ہم سب کو سخت قلبی مسرت محسوس ہوئی آپ کو جان کر۔ اور امید کی جاتی ہے کہ آپ جلد ہی خود کو میڈ ہیٹرز میں شامل ہونے کا اہل ثابت کریں گے۔ کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ آپ پی چو کے دوست ہیں اور کوئی سوبر آدمی پی چو کا دوست نہیں ہو سکتا" ڈائمنڈ نے پیانو کے اسٹول پر چڑھ کر بڑی سنجیدگی

سے ایک اور تقریر کی۔

"اچھا اب شریفوں کی طرح کرسیوں پر بیٹھا جائے یا اسی طرح کھڑکیوں میں لٹکتے ہوئے سارا سوشل ایونٹ رہے گا" کرن نے کہا۔ لفظ "سوشل" ان سب کی زبان میں ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ ایک روز کنور رانی آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے موقعے پر اپنی ایک دوست کو کچھ کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کے متعلق سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں "اے بہنی ابھی تو سوشلسٹوں کا کہنا ہے کہ سوشلزم —" پی جے صرف اتنا فقرہ سن پایا تھا اور اس روز سے یہ لفظ بڑے مزے سے استعمال کیا جاتا تھا۔

"بھئی تم سب لوگ ٹھیک سے بیٹھ جاؤ تو ہم چاء منگوائیں"۔ رخشندہ گیلری کی طرف چلی گئی۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے کھڑا سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے تعلق۔ بے پروا۔ مغرور۔ اس کی کالی خوبصورت آنکھوں میں وہی اکتاہٹ جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ زندگی سے تھک ہار کر کسی نئی بات کسی خاص واقعے کا منتظر ہو اور وہ کبھی نہ ہو چکے۔ کبھی نہیں۔

رخشندہ کے ساتھ گیتی اور ڈائمنڈ بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں اور جب چاء آئی اس وقت تک پی جے، کرن اور سلیم بڑی تندہی سے اپنی دلچسپی کی باتوں میں مشغول ہو چکے تھے۔

چاء پر لڑکیاں بہت صبر کے ساتھ ان کی انڈین پولیس اور تبادلوں اور مقابلے کے امتحانوں کی غیر دلچسپ باتیں سنتی رہیں۔

"اب تم آدمی لوگ کرکٹ اور شیر کے شکار اور گھوڑوں کا تذکرہ شروع

کردو گے۔" رخشندہ نے بے حد اکتا کر کہا۔

"اچھا نہیں۔ کہو بھئی سلیم تم نے یہ ٹائی کہاں سے خریدی۔ اوگوش کتنا سویٹ رنگ ہے۔ اس کا۔۔۔ ارے پی چو ڈارلنگ بالکل ایسا ہی سوٹ کا کپڑا۔ کل میں نے لیلا رام کے ہاں دیکھا اور سُنا تم نے کرن پیارے۔ میں نے اپنی سفید سینڈل جو چائنا مین کی دکان سے بنوائی تو کیا ہوا کہ ۔۔۔"

"اچھا چپ رہئے جناب۔" چائے ختم کرنے کے بعد لڑکیاں خفا ہو کر چلی گئیں۔

"ارے ٹھہرو۔ کہاں جاتی ہو تم لوگ۔" پی چو چلّایا

"ہم "لالہ رخ" جا رہے ہیں اور پی چو میں تمہاری موٹر لئے جاتی ہوں۔ اب ٹاپتے رہو بیٹھے۔" رخشندہ نے برساتی میں سے آواز دی۔

"ارے رکو تو سہی۔ ہم بھی "لالہ رخ" چلتے ہیں۔" پی چو اور کرن اپنے نئے مہمان کو لے کر برآمدے میں آ گئے۔

"آیا کرو بعد میں۔ حفیظ نہیں ہے آج کل۔" رخشندہ نے اجنبی کار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا

"کرسٹابل تو ہوگی۔" پی چو بولا۔

"ہوا کرے۔ لڑکیوں میں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں جناب کو۔ ہاں بھئی اور کیا۔ ہم تو کریں گے ہی ساریوں اور جوتوں کی باتیں۔ پھر تم سے کیا۔" رخشندہ نے جواب دیا۔

"اور پھر بھائی صاحب قبلہ ہم جائیں گے "وکڈ لیڈی" دیکھنے۔ بہترین برٹش پروڈکشن ہے۔" ڈائمنڈ نے کہا۔

"کیا لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مری جا رہی ہیں سب کی سب جمیں ملبین پر اکھٹی سب کی بھیڑ چال ہوتی ہے۔" پی چو بولا۔

"سب کا ٹریڈ یونین انٹرسٹ ہوتا ہے بھائی۔" کرن نے بڑے مفکرانہ انداز سے کہا۔

"اچھا تو آپ کیوں مرتے ہیں انگریڈ برگمین پر۔ للیئے جناب پی چو صاحب پچھلے اتوار کو آپ کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے تو میں لے گئی تھی آپ کو۔ "بیلز آف سینٹ میری" دکھانے۔ نکالئے اس کے روپے واپس۔" رخشندہ نے پی چو کا کوٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

"الامان والحفیظ۔ جانے غفران منزل سلامت کیسے بچی ہے ان دھابھاروں کے باوجود۔" کرن نے کہا۔

"ہم شہید مرد جو رہتے ہیں اس میں۔ ورنہ میاں کب کا تختہ الٹ گیا ہوتا ساری دنیا کا۔ تم ایک غفران منزل لئے پھرتے ہو۔" پی چو نے جواب دیا۔

"اور کیا۔ شہید مرد۔ جن بھوت یہ سب تم ہی لوگ تو ہو۔" رخشندہ خوش ہو کر بولی۔

"اور آپ لوگ؟ یہ ایک بھٹ کٹیا پر کی۔ ایک برگد پر کی۔ ایک پیپل پر کی دیکھو تینوں بھری دوپہریا میں کیسی گھس منے نکل آئی ہیں۔ اب یہ ٹلیں گی تھوڑا ہی جب تک پاؤ بھر مرچوں کی دھونی نہ دی جائے۔" پی چو نے کہا۔

"قسم سے ہم مار دیں گے پی چو۔" رخشندہ عاجز آ کر چلائی

وہ سب کار کے قریب پہنچ گئے۔ پی چو انجن کھول کر دیکھنے لگا۔ کرن رخشندہ سے الجھتا رہا۔

"تو گویا یہ یوں ہے۔" برساتی کے قریب چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد سلیم نے سگریٹ کیاری میں پھینک دیا اور اس مجمع سے جا ملا۔

وہ سب کرسٹابل کے ہاں پہنچے۔ دوستوں کی پلٹن آتی دیکھ کر وہ اچھل پڑی

"ارے میرے پیارے بچو۔" وہ چلائی۔ برآمدے میں آکر سب اپنی اپنی پسندیدہ جگہوں پر بیٹھ گئے۔ پی چو حسبِ معمول دریچے میں جا لٹکا۔

"چاء منگواؤں؟" کرسٹابل نے رخشندہ کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چاء بعد میں منگوانا پہلے یہ غور فرماؤ کہ کس قدر خاص الخاص ذاتِ شریف ہمارے ساتھ تشریف لائے ہیں۔" پی چو نے کہا۔

"اوفوہ بھئی ایک ہفتے سے کرن اور حفیظ آپ کا اتنا ذکر کر رہے تھے کہ مصیبت آگئی تھی۔" کرسٹابل نے سلیم سے کہا۔

"ارے رے رے روشی تم کیوں تھوتھنی پھلائے بیٹھی ہو۔" پی چو نے دفعتاً پوچھا۔

"بھئی کرسٹابل پی چو دوپہر سے لڑے جا رہا ہے۔" رخشندہ نے شکایتاً کہا

"ارے تو تم کیوں جلی جاتی ہو۔ ہمارا ایک نیا دوست آگیا ہے۔ اب ہم تمہیں لفٹ ہی نہیں دیا کریں گے۔ ہم تو بھئی جا رہے ہیں جیمس میسن کی فلم سیکنڈ شو۔ کیوں سلیم ڈارلنگ چلو گے؟" پی چو نے بالکل لڑکیوں کے لہجے کی نقل کی۔

"اچھا پی چو۔ چپ تو۔ آپ یہاں کب تک رہیئے گا؟" کرسٹابل نے سلیم سے پوچھا

"فی الحال تو اسے جوائننگ ٹائم ملا ہے۔ ممکن ہے یہیں تقرر ہو جائے۔"

کرن نے کہا۔

"اور کیا لکھنؤ جو ایک بار آجائے۔ اس کا یہاں سے جانے کو کب جی چاہتا ہے؟" ڈائمنڈ بولی۔

"آپ لکھنؤ پہلے بھی کبھی آچکے ہیں؟" کرسٹابل نے پوچھا۔

"ارے اس نے پڑھا ہی کنگ جارجز میں ہے۔" کرن نے جواب دیا

"اچھا آپ بھی لکھنؤ کے پڑھے ہوئے ہیں"۔ رخشندہ بولی۔

"اور کیا سب شریف آدمی لکھنؤ کے پڑھے ہوتے ہیں"۔ پی جو نے کہا

"پی جو تم سے قطعی کوئی بات نہیں کر رہا ہے"۔ رخشندہ نے بگڑ کر کہا۔

لیکن ہو یہ ہی رہا تھا جتنے سوالات کرسٹابل سلیم سے کر رہی تھی۔ ان کے جواب بات ختم ہونے سے پہلے ہی جلدی سے کرن یا پی جو دے دیتے تھے اور سلیم اسی طرح چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"اگر سب لوگ اس قدر ہڑ بڑا کر اتنا ان کا نوٹس نہ لیں تو ان صاحب بہادر کا دماغ اتنا خراب نہ ہو"۔ لالہ رخ سے واپسی میں سلیم کو کارلٹن ہوٹل اتار کر جب وہ سب گنی اور ڈائمنڈ کو پہنچانے جاپلنگ روڈ جا رہے تھے۔ اس وقت گنی نے چپکے سے رخشندہ سے کہا۔

یہ وہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ جس کے امرت شیرگل کے سے سیدھے سیاہ بال تھے۔ جس کا میڈونا کا سا ہسپانوی یا ارمنی چہرہ تھا جسے دیکھ کر جی گھبراتا تھا اور لگتا تھا کہیں آگ بھڑک اٹھی ہے یا کہیں سارناتھ کے اندھیرے

مندر میں تیز سُرخ، روشن، جاندار، مخملیں گلاب جگمگا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ ہی اتنے سُرخ رہتے تھے۔ وہ جو ایک دوسری، الف لیلوی، پرانی دنیا کی محرابوں میں سے نکل کر دفعتہً زندگی میں اس کے سامنے، وہاں آگئی تھی۔ اس الف لیلوی دنیا میں سے جس کی داستانیں گومتی کے کنارے جامنوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیوں میں بیٹھے بوڑھے ملاح اب بھی اجنبی مسافروں کو سناتے ہیں۔ وہ تو اسے جانتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے معلوم تھا۔ زندگی کے کاروانوں کے ساتھ گھومتے ہوئے وہ کبھی نہ کبھی اسے دوبارہ ملے گا۔ کہیں نہ کہیں ضرور اسے دیکھ پائے گا۔ وہ جو بہت اخلاق سے اس سے کہتی تھی اگر آپ کچھ عرصہ پہلے آئے ہوتے تو دیوے شریف کے میلے میں ہمارے ساتھ چلتے۔ پھر ہم آپ کو اپنے جنگلوں میں مرغابیوں کا شکار کھلاتے۔ میاں رودلی سے آجائیں تو کرسمس میں ہم سب پھر شکار کے لئے نیپال گنج کے جنگلوں میں چلیں گے۔ بہرائچ سے آگے۔ وہاں سے نیپال کی سرحد شروع ہوتی ہے اور وہاں ڈھیروں شکار ملتا ہے۔ وہ جو چیتے کی کھال بچھی ہے۔ وہ پچھلے سال بیہ لو نے مارا تھا اور یہ بارہ سنگھا میں نے۔ لیکن میرا نشانہ تو بہت ہی خراب ہے۔ یہ پرسکون آنکھوں والی میڈونا شیر کے شکار کی باتیں کرتی تھی محض اس لئے کہ اس کے خیال میں یہ اس کے مہمان کی دلچسپی کی باتیں تھیں۔ وہ ایک مکمل میزبان تھی۔ اس کی یہ پرسکون آنکھیں جو اسی طرح جھپکتی تھیں جیسے اس دیوانی دنیا کو دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ اور پریشان ہوتی رہتی ہوں۔ یہ آنکھیں جن کی گہرائیاں کہتی تھیں۔ ہم تو کائنات وہستی کے ان سارے رازوں کو جانتے ہیں جو خدائے قدوس

کے فرشتوں سے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ہم تمہیں بھی جانتے ہیں۔ ہمارے سامنے اتنا بنا مت کرو۔ تم جو کیپری کے جزیرے کے لاابالے سیلانی ہو۔ اس کیپری کے جزیرے کی خواہش جس کی یاد سبھی کے دل میں ہوتی ہے۔ بہت سے اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کے چاروں طرف لہریں مارتے ہوئے اتھاہ سمندر کی اونچی موجوں سے ٹکراتے رہتے ہیں اور کبھی اس تک نہیں پہنچ پاتے۔

وہ بہت دنیا گھوم کر وہاں پہنچا تھا اور اسے پھر وہاں سے آگے، جانے کہاں کہاں جانا تھا۔ یہ کرسمس کی شام تھی اور وہ دلکشا کلب کی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ اس وقت شانتی نکتین کا او شیر لہری روح کی تلاش میں نہ معلوم کہاں مارا پھر رہا ہوگا امرناتھ اور ہر دوار کی کن گپھاؤں میں شانتی اور مکتی کھوجتا ہوگا۔ اس کی جانے کتنی تصویریں مکمل اور کتنی ادھوری پڑی ہوں گی۔ یہاں پر تورنگین کے ہاں کے سلے ہوئے دھاری دار سوٹ اور چیختے چلاتے رنگوں کے اسکارف والے چودھری شمیم لاؤنج کے وسط میں بے معنی باتیں کر رہے تھے اور شعر پڑھتے جاتے تھے۔

"قیامت آئے وہ آئیں یا انقلاب آئے"۔ انہوں نے بے حد اسٹائل سے ایک مصرع پڑھ کر گیلری کی طرف دیکھا۔

وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اندر آ رہی تھی۔

"یار یقیناً تمہیں کوئی لونڈیا جلٹ کر چکی ہے۔ ورنہ اس بے نیازی کا مطلب"

چودھری شمیم نے دفعتاً اسے مخاطب کیا
"کیا آپ رخشندہ بیگم کو جانتے ہیں؟"
"ابھی میں رخشندہ بیگم کیا ان کے باپ تلک کی سات پشتوں سے واقف ہوں۔ بڑی ماسٹرپیس لونڈیا ہے۔ لیکن حد سے زیادہ مغرور۔ فیض آباد والے کنور عرفان علی کی لڑکی ہے۔ کیا چیز ہے، کیا چیز ہے، کیا چیز ہے واللہ" انہوں نے زیادہ تصریح سے کام لیا۔

وہ بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا ____ یہ بیکار، بے مصرف امیر زادے جو اسی طرح کلبوں میں سگار کے دھوئیں اڑاتے اور کوک ٹیل کے گلاس خالی کرتے کرتے سوسائٹی کے اسکینڈلز پر زندہ رہتے ہوئے اپنی عمریں بتاتے ہیں وہ ان کی اس دنیا سے اتنا عاجز تھا۔

اور وہ اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی جگمگاتے ہوئے مجمع میں شامل تھی جو وہاں موجود تھا۔ یہ سب لوگ ____ امبر پور راج کا انور اعظم اور رسانگ پور کی کرسٹابل اور حفیظ احمد اور کرشن نرائن کول آئی۔ سی۔ ایس کا خاندان اور ریاست بجوا اور پرتاپ گڈھ کے مہاراج کمار۔

کرسمس کی وجہ سے دلکشا کلب کی رونق اور چہل پہل روزمرہ سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ ہال کی چھت میں رنگ برنگے کاغذی ربن، جاپانی قندیلیں اور رنگین غبارے جھول رہے تھے۔ ہال، لاؤنج اور سارے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ سلیم کو عفران منزل کے شگفتہ اور بشاش سٹ سے ملتے ہوئے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہونے آیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز کلب، عفران منزل یا لالہ رخ میں

ان سب سے ملنا ہو جاتا تھا۔ آج رات بھی اسے پی جی اور پولو نے کرسمس ڈنر کیلئے کلب میں مدعو کیا تھا۔ اس نے سوچا۔ کسی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ عفران منزل والے جہاں جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ آفتاب کی حیات زا کرنیں بکھیرتے جاتے ہیں۔

وہ لاؤنج میں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ چودھری شمیم کے قہقہے دیر تک اس کے کانوں میں گونجا کئے۔ اسے اپنے چند اور دوست نظر آ گئے اور وہ ان کے ساتھ بار کی طرف چلا گیا۔

اس کی زندگی تو ایک پہاڑی دریا کی طرح تھی جو پتھروں پر سے گذرتا اور آبشاروں میں گرتا تھوڑی دور جا کر کچھ فاصلے کے لئے سبک خرام ندی میں تبدیل ہو جاتا اور پھر، آگے بڑھ کر، ایک نئی وادی میں پہنچ کر پھر تند رو دھارا بن جاتا۔ جس کو بالکل پتہ نہیں کہ آگے جا کر کیا ہو گا۔ وہ عموماً خاموش رہتا اپنی دلکش خاموشی، اپنی دلچسپ گفتگو اور اپنی کالی آنکھوں سے بڑے بڑے جادو جگاتا۔ بڑی بڑی قیامتیں اٹھاتا اور خود مزے سے ایک کونے میں بیٹھا پائپ پیتے ہوئے محظوظ ہوتا رہتا۔ وہ گیلنٹ بالکل نہیں تھا۔ وہ خواتین کیلئے بالکل بے پروائی سے کار کا دروازہ کھول دیتا۔ خود الگ ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا۔ کلوک روم سے نکلتی ہوئی بیگمات کو وہ اس بےفکری اور بے تعلقی سے اوورکوٹ پہننے میں مدد دیتا۔ گویا ان پر بڑا احسان کر رہا ہے۔ وہ شولرس یا لیڈیز مین کسی حالت میں بھی نہ بن سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت مہذب، بے حد پولشڈ اور سوسائٹی میں بے انتہا ہردلعزیز تھا اور اپنی ان فتحمندیوں پر چپکے سے مسکرا لیا کرتا تھا۔ اسے اپنا حسن، اپنا غرور، اپنی شہرت پسند تھی؛

ان سب چیزوں سے زندگی بڑی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اس کا دن دفتر میں، سہ پہریں دوستوں کے ہاں، اور شامیں کلب میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے عموماً تین فون نمبر رہتے تھے۔ ایک دفتر کا۔ ایک گھر کا۔ ایک کلب کا۔ گھر کا فون عام طور پر 'ڈیڈ' رہتا تھا۔

"ہلو فوکس!" وہ کر بکریز اور کاغذی ٹوپیاں تقسیم کرتی اس کی طرف آگئی۔ اسے دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے، ایک دوسری غیر ملکی قوم کا تہوار تھا لیکن اس قدر زور شور سے اس کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جیسے دلکشا کلب کے یہ سارے ہندوستانی ممبر ابھی ابھی خود سینٹ جوزف کے عبادت خانے سے ماس میں شرکت کر کے آ رہے ہیں۔

انھوں نے رات گئے تک کھیل کھیلے۔ ڈنر کھایا۔ گانے گائے۔ ناچ ناچے۔ وہ اس روز دیر تک اُس کی پارٹنر رہی۔

"اوہ ۔۔ اوہ خوبصورت عورت"۔ اُس نے دل میں کہا۔ وہ اس کے ساتھ ناچتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئے۔ ہال میں گرمی بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے والز کرتے کرتے باہر چبوترے پر آگئے۔ ہال کی روشنی اور شور کے مقابلے میں یہ جگہ بالکل ایک دوسری دنیا معلوم ہو رہی تھی اور وہ خود ایک دوسری ہستی اس ہستی سے بالکل مختلف جو ابھی کچھ دیر پہلے کریکرز کھینچ کھینچ کر خوب شور مچا رہی تھی۔ یہ شاید فضا کا اثر تھا۔ فضا اور ماحول سے متاثر ہو کر بعض مرتبہ عجیب عجیب خیالات دماغ میں آتے ہیں۔ انسان بالکل اسی ماحول کا ایک جزو بن کر رہ جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ابھی کچھ دیر اور اس کا طلسم نہ ٹوٹے۔

وہ اسی طرح چپ چاپ چبوترے پر ٹہلتے رہے۔ وہ ایک دفعہ پہلے بھی ایک ایسی ہی الف لیلوی فضا میں اسی خاموشی سے ایک دوسرے کے ناچ کے ساتھی رہ چکے تھے اور اس رات کی یاد بڑی تکلیف دہ بڑی مضطرب کرنے والی ثابت ہوئی تھی عجیب بات تھی کہ ان دونوں کے دل میں اس وقت اسی کا خیال آیا (انہوں نے ایک دوسرے کو بتائے بغیر جی میں طے کر لیا کہ اب وہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہ ناچیں گے کبھی ایک دوسرے کے اتنے قریب نہ آئیں گے)

وہ والز کے تیز تیز قدم رکھتے ہال میں واپس آ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بہت سے جوڑے بال روم میں سے نکل کر برآمدے اور چبوترے پر ناچنے لگے۔ کچھ منچلے باہر لان پر جا کر وکٹورین والز کے تیز چکر دں میں گھومنے میں مشغول ہو گئے۔

ناچ کے ساز چیختے رہے۔ خود موسیقی کا طاقتور شیطان ان سازوں کو زور زور سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہا تھا۔ رقصاں جوڑے زنّاٹے کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ دنیا گھوم رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے جل رہے تھے۔ وہاں پر دیوانی موسیقی تھی اڑ گھرے رنگوں اور خوشبوؤں کا طوفان، روشنی، گرمی ــــــــــ

جشن رات بھر جاری رہا۔

ایک بجے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر واپس چلی گئی۔ کروا ہا راج کی کنور رانی کی اجازت نہیں تھی کہ ان کے بچے رات گئے تک گھر سے باہر رہیں اسے بھی نیند آنے لگی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کرتے ہی والا تھا کہ گوکٹیل کا

پچیسواں دور شروع ہوا اور مسز ہری پال آئی سی ایس کی خوبصورت پینتیس سالہ بیوی چندرا نے اسے روک لیا۔

صبح ہوتے خواتین نے کلب سے نکلنا شروع کیا۔ بھاری اوورکوٹوں، کندن کے گہنوں، اطلسی غراروں اور جھلملاتی ساریوں میں سرسراتی ہوئی خواتین جن کے شوہر یا بھائی یا دوست ان کے اوورکوٹ لئے کلوک روم اور برآمدوں میں ان کے منتظر تھے اور جن کے شوفر سردی کی وجہ سے موٹروں کے شیشے چڑھائے پچھلی سیٹوں پر سکڑ کر سو رہے تھے۔ یہ شاندار عورتیں جن کے دماغ خالی تھے۔ روحیں کھوکھلی تھیں۔ دل بلا کسی مصرف کے یونہی عادتاً دھڑکتے تھے۔ صرف ان کے ہونٹوں پر میکس فیکٹر اور ڈوروتھی گرے کے رنگ تھے اور غراروں اور ساریوں پر زردوزی کے پھول جگمگاتے تھے۔ صبح کی ہلکی روشنی میں کلب کے قمقمے دھندلے پڑ گئے تھے اور فضا میں خوشبوؤں، اور تمباکو کے دھوئیں کی تھکی ہوئی مہک اُمڈ رہی تھی

اور چندرا ہری پال جب کلوک روم میں سے باہر نکل رہی تھی تو صبح کی اوّلیں ساعتوں کے دھندلکے میں سلیم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے اور اس کا میک اپ پھیکا پڑ چکا تھا اور وہ بہت عمر رسیدہ نظر آ رہی تھی۔

اسے بڑی عجیب سی تکلیف محسوس ہوئی۔ کیا عورت محض یہی ہوتی ہے محض یہی۔ یہ سب خوبصورت، شاندار، بڑھیا عورتیں۔ دفعتہً اسے وہ بھورے بالوں والی معمولی اینگلو انڈین کیبرے ناچنے والی لڑکی یاد آئی۔ وہ اس نواب زادی اصغر

امام اور مسز چندرا ہری ہر پال اور راجکماری کمل گڑھ کے جگمگاتے ہوئے گروہ سے یقیناً بہت بہتر تھی۔ اس میں اخلاقی جرأت تھی۔ وہ ہمدردی اور خلوص کی اہل ہو سکتی تھی۔ وہ صبح کے دھندلکے میں اتنی کھسیانی، اتنی پھیکی اور خزاں رسیدہ نظر نہ آتی تھی۔

یکلخت شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ اس راجکماریوں کی دنیا سے بھاگ کر کہیں اور پناہ لے۔

اور کہر آلود مال پر پہنچ کر اس نے کار کا رخ آئیوی کورٹ کی طرف جانے والی بیرو روڈ کی سمت کر دیا۔ جہاں کوئین ترو ز رہتی تھی۔

خیالات عجیب و غریب غیر منطقی خیالات، وہ آوارہ گرد خانہ بدوش جو دماغ کے پچھلے دروازے پر چپکے سے دستک دے کر سکون دل میں نہایت گستاخی سے مخل ہو کر پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی عجیب و غریب، شریر، چور اچکا ایک خیال اس کے میڈونا ایسے خوبصورت سر میں رات کے پچھلے پہر آگھسا جبکہ وہ کرسمس کے جشن سے تھکی ہاری واپس آ کر لباس تبدیل کرتے ہوئے سردی کے مارے سوں سوں کرتی جاتی تھی اور چاہتی تھی کہ گل شبو کو جگا کر کمرے میں انگیٹھی منگوائے۔ ہش۔ اس نے سر ہلا کر جی میں کہا۔ لاحول ولا۔ چچ چچ۔ حد ہو گئی یعنی بھئی انتہا ہوتی ہے ۔ کمال ہے۔ تو چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ شخص، یہ کالی آنکھوں والا مغرور سلیم۔ ایک بہت ہی ڈسٹرب کرنے والی شخصیت کا مالک تھا۔ ارے ہائے ۔ حد ہو گئی بھئی لیکن یہ حقیقت تھی اور حقیقت سے جان بچانی بہر حال

بہت مشکل ہے۔

کسی نئی پریشان کن کشش کا احساس موسم بہار کی آمد کی طرح بالکل دفعتہً اور آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ سامنے دیوار پر کیلنڈر دیکھ کر ایک نیا خیال شروع نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے ہم خود ہی ایک صبح جاگ کر دریچے سے باہر دیکھتے ہیں کہ دنیا میں یکلخت بڑی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ درختوں کے پتے نکھر رہے ہیں۔ ہرے پودے گھاس پر جھک کر لہلہا رہے ہیں۔ گھٹائیں چھانے لگی ہیں اور ہوا میں موسیقی کی لرز گونج اٹھی ہے۔ اور ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ برکھا اور پھولوں کا موسم بالآخر آن پہنچا اور پھر یوں ہوتا ہے کہ زکام کی چھینکوں کی طرح اس نئی کشش کا احساس بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ کتنی ہنسی کی بات تھی لیکن بہرحال تھی۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ سردی کے مارے ناک کو لحاف میں چھپا کر اس نے طے کیا۔ وہ قطعی اس کی قائل نہ تھی۔ گنّی اور کرن جیسے دیوانوں کے اس فلسفے کی۔ شاید اوسکر وائیلڈ تھا جس نے طنزیہ کہا تھا کہ زندگی کی انجیل کا پہلا باب ایک عورت اور ایک باغ سے شروع ہوتا ہے اور انکشافات کے باب پر آن کر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔" چنانچہ میں پہلے ہی روز انٹی لٹریری بھی بن گئی یعنی چھوتے ہی اوسکر وائیلڈ یاد آیا۔ اب غالباً شیلے اور براؤننگ کا حوالہ دیا کروں گی۔ اُف!" لیکن وہ ایک نارمل اور صحت مند قسم کی لڑکی تھی اور ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو خواہ مخواہ بنتی ہیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ سب ٹھیک ہے۔ گولی مارو۔ ہٹاؤ اس قصے کو۔ اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اور یہ فیصلہ کر کے وہ سو گئی۔ کیونکہ اس کی ناک کی نوک بالکل سرد ہو چکی تھی اور سلیم کے خیال کے [illegible]

لحاف فی الحال کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔

ہینس اینڈرسن نے کہا تھا کہ ہر انسان کی زندگی پریوں کی ایک کہانی ہے جو خداوند خدا نے خود لکھی ہے۔ وہ ایک تخیل پرست رومانی تھا جس نے اسنو وائیٹ اور سنڈریلا کی ایک علیحدہ دنیا تخلیق کی تھی جو صرف بچوں کو مطمئن کر سکتی تھی۔ اسے شاید پتہ نہیں تھا کہ ایک لاپرواہ خدا کی بنائی ہوئی اس بدصورت دنیا میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی تکلیفیں ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے دکھی انسانوں کی زندگیاں پریوں کی کہانیاں کسی حالت میں نہیں ہو سکتیں۔

پھر بھی یہ لڑکی، یہ کالی آنکھوں والی اسنو وائیٹ جو کرسمس کے جشن میں خوب شور مچانے، کئی گھنٹے ناچنے اور کریکرز کھینچنے کے بعد اب اطلس کے لحاف میں ناک چھپائے سو رہی تھی۔ ہینس اینڈرسن کی دنیا کی ان ہری وادیوں میں مزے سے اپنا جیون بتائے جا رہی تھی۔ جہاں پھول کھلتے تھے اور برکھا کی ٹھنڈی پھواریں برستی تھیں۔ اب تک وہ اور اس کے ساتھی خداوند عالم کے کچھ بہت ہی خاص الخاص بندے معلوم ہوتے تھے۔ خدا ان کے کاروبار میں یقیناً ناک نہ ڈبوتا تھا۔ ان کے کرداروں پر ان کی طبیعتوں اور ماحول کا اثر بہت گہرا تھا۔ وہ پرانی روایتوں کے پس منظر میں غفران منزل کی قدیم محرابوں کے نیچے پروان چڑھے تھے۔ انہیں ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا۔ یہ کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یوں ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ سب بالکل ٹھیک حساب کتاب تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش رہتے تھے

اس نے سوتے میں کروٹ بدلی۔ دسمبر کی اس برفانی رات جبکہ باہر خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ اپنے خوبصورت کمرے میں محفوظ اور مطمئن اچھی اچھی

چیزوں کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ان پرانی کرسمس کے جشن کی راتوں کے خواب جو
اُس نے اسکول اور کالج میں بسر کی تھیں۔ ان پرانے گیتوں کے سپنے جو اس نے
کالج کے یوکلپٹس گروو میں الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے گائے تھے۔

سڑک کے اس پار سینٹ جوزف کے عبادت خانے میں آدھی رات کے
ماس کے گھنٹے بجنے لگے۔ کہیں دور رات کے سناٹے میں کیرل گانے والوں کی
ٹولیوں نے اپنے نغمے شروع کر دیئے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب میں وہ دیکھ رہی
تھی کہ بہت تیز روشنی ہو رہی ہے اور اچھے اچھے لوگ بہت بڑھیا گانے گا رہے
ہیں اور خوب مزا آ رہا ہے اور اُس کی آنکھ کھلی تو اسے کیرل گانے والوں کی آوازیں
سنائی دیں۔ وہ چپ چاپ پڑی سنتی رہی۔ "خاموش رات، مقدس رات، مقدس
ماں اور اس کا بچہ" اور "سنو سنو پیغامبر فرشتے گاتے ہیں" ۔ اس کے دماغ میں
بہت سے خیالات امڈ آئے۔ بہت پرانی یادیں۔ اور اس وقت وہ سلیم کو بالکل
بھول چکی تھی جس کا خیال تھوڑی دیر پہلے اسے اتنا تنگ کر رہا تھا۔ مقدس
موسیقی اور کیرل کی آوازیں سنتے سنتے یادوں کے ریلے میں بہہ کر وہ ان لمحات
سے بہت دور بہت پیچھے پہنچ گئی۔ وہ کتنا اچھا زمانہ تھا۔ کتنی پیاری دنیا تھی جو
بہت دور رہ گئی تھی۔

وہ زمانہ جب وہ اسکول کے پیٹرن سینٹ کے تہوار یا دوسرے چھٹی کے موقعوں
پر کشتیوں میں بیٹھ کر ندی کے کنارے کنارے ہرے جنگلوں کے وسط میں پہنچ جاتے۔
جہاں جنگل کی خنک نم زمین پر خودرو پودوں کے درمیان لکڑیاں جمع کر کے الاؤ جلتا۔
لڑکے ایک طرف اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے۔ لڑکیاں خشک ٹہنیاں چننے کے لئے

چلی جاتیں۔ پرانے گیت گائے جاتے۔ الاؤ کے گرد گھومتے ہوئے سال بھر کی پرانی چیزیں پرانی کاپیاں آگ میں پھینکی جاتیں۔ ہر نئی چیز کے آگ میں گرتے ہی نئے شعلے بھڑک اُٹھتے۔ ان شعلوں کے چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے ان کے چہرے تمتما اُٹھتے کھلی فضا اور ٹھنڈی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے نوجوان، بشاش، صحت مند چہرے۔ دور کشتی میں بیٹھی ہوئی کوئی لڑکی گانا شروع کر دیتی۔ ''او مائی ڈارلنگ کلمنٹائن'' یا ''اولڈ فوکس ایٹ ہوم'' یا ''فیئر دی ویل مائی فیری فنے''۔۔۔ اور اس سکوت میں چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سب اس گیت میں شامل ہو جاتے۔ رات کے اندھیرے میں گیت کی لہریں بہت اونچی اٹھ جاتیں۔ الاؤ کے شعلے لپکتے رہتے جنگل کا سناٹا گہرا ہو جاتا۔ دور پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے راہی ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہتے۔ آج بھگتن کے کالے اسکول کی بابا لوگ چھٹی منانے آئی ہیں اور اس اندھیرے میں چند لمحوں کے لئے ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی۔ مدھم چاندنی اور پرانے گیتوں اور الاؤ کے رقصاں شعلوں کی دنیا۔ بہت سے معصوم دل ایک ساتھ دھڑکتے۔ بہت سی معصوم تمنائیں اکٹھی پیدا ہوتیں۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔

''انگریزی تعلیم بھائی جان۔ صحیح تلفظ۔ ڈنر ٹیبل کے قاعدے۔ یہ سب سکھانے کے لئے تمہیں اپنے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی اسکولوں میں بھیجنا چاہئے'' جب وہ تینوں بہن بھائی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس وقت کنو صاحب نے ولایت سے واپس آنے کے بعد اپنے ایک مصاحب سے کہا تھا۔

چنانچہ وہ نینی تال بھیج دیئے گئے تھے۔ سینٹ جوزفز کالج بہت بڑا ادارہ

تھا۔ اس کے راہب آئرش تھے۔ نیلی آنکھوں والے آئرش اور لڑکیوں کے اسکول کی راہبات کی آئرش آنکھیں بھی ہمیشہ مسکراتی تھیں۔ سینٹ جوزفس کالج میں کیسے کیسے لڑکے آتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گمنام ہندوستانی ریاستوں کے پرنس جن کے رنگ برنگے بریچز پہنے بڑے بڑے جودھپوری صافے باندھے اتالیقوں اور نوکروں کی پلٹنیں ہوتیں۔ رانا شمشیر دل۔ پرنس مظفر خاں۔ صاحبزادہ شہاب الدین۔ پرنس مظفر۔ پرنس مظفر۔ اس کا خاندان کابل کی لڑائی کے بعد صدی کے شروع میں جلاوطن کر کے ہمالیہ کی ایک وادی میں نظربند کر دیا گیا تھا۔ جہاں سابق امیر کابل اور ان کے رشتہ دار دن بھر شطرنج کھیلتے اور خواتین چہار دیواری کے اندر سگریٹ پیتے ہوئے زندگیاں بتاتی تھیں۔ اب ان میں آزادی آچلی تھی۔ سیاہ چادریں ترک کر کے انگریزی لباس میں سائیکلوں پر گھومتی ہوئی وہ اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لڑکوں نے انگریزی سرکار سے ملنے والے چھوٹے چھوٹے وظیفوں سے تنگ آکر فوج میں نوکریاں کر لی تھیں اور اسی فوج کی وردیاں پہن کر شان سے گھومتے تھے جس نے انہیں ان کے ملک سے نکالا تھا۔ وہ بہت شاندار لڑکا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ وہ کالج کی ہر ٹیم کا کپتان اور بہت اچھا شہسوار تھا۔ جب اپنے گھر والوں کے ساتھ فارسی بولتا ہوا وہ وائلڈ فلاورز ہال آتا تو زخشندہ پہ سخت رعب پڑتا تھا۔ وہ لڑکپن میں پی چو کی پہلی محبت تھا اور اس لئے وہ اس سے بے انتہا جلتی تھی۔ وہ پی چو کو خوب 'بُلی' کرتا اور پی چو اس کے سارے احکام نہایت فرمانبرداری سے بجا لاتا۔ وہ 'بڑا لڑکا' ہونے کی قابل رشک حیثیت کے سارے فائدوں سے واقف تھا۔ وہ ان سب لوگوں سے جلتی تھی جو پی چو کو پسند

کرتے تھے۔ پی جو صرف اس کی ہی ملکیت ہونی چاہئے تھا۔ ایک روز وہ سب وائلڈ فلاور ہال کے باغ میں "روبن ہڈ" کا کھیل کھیل رہے تھے۔ برآمدے میں پڑی ٹوٹی الماری میں چھپ کر وہ سب رابن ہڈ کی تاک میں بیٹھے تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ جب پہاڑی کے پیچھے سے پرنس مظفر اپنا بگل بجائے گا۔ تب میڈ میرین جلدی سے الماری میں چھپ جائے گی۔ لیکن وہ الماری میں نہیں چھپی۔ کیونکہ اس میں چھچھوندر کی شکل والا اینگلو انڈین ڈیرک بھی گھسا بیٹھا تھا اور ڈیرک سے اس کو نفرت تھی وہ گئی اور ڈائمنڈ کے ساتھ چٹان کے پیچھے چھپی رہی اور چٹان پر سے نیچے گھاس پر کودتے ہوئے پرنس مظفر کا پیر رپٹ گیا اور وہ گر پڑا اور اسے یقیناً شدید چوٹ آئی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گئی اور بے حد فکر مندی سے چلائی۔ مظفر جلدی سے ممی کے پاس چلو وہ تمہارے پیر کی ڈریسنگ کر دیں گی۔ بھاگ جاؤ بیوقوف لڑکی۔ اس نے درشتی سے کہا اور فوراً اٹھ کر کھیل کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا جب شام پڑے وہ وائلڈ فلاور ہال سے واپس جا رہا تھا تو رخشندہ نے دیکھا کہ وہ بے حد دلکش انداز سے لنگڑا رہا تھا۔ رخشندہ کے دل میں، حالانکہ وہ پی جو کی وجہ سے اس سے جلتی تھی۔ اس کی عقیدت زیادہ ہو گئی۔ لیکن جب سترہ اٹھارہ سال ہی کی عمر میں اس نے نینی تال کی اینگلو انڈین لڑکیوں کے ساتھ کشتی رانی شروع کر دی تو رخشندہ کا یہ پہلا آپالو اپنے ستون پر سے گر کے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا۔ کیا یہ کمبخت محض یہی ہوتے ہیں۔ محض یہی۔ اس نے مایوسی کے شدید احساس کے ساتھ ایک مرتبہ سوچا تھا۔

بڑی عجیب بات تھی کہ آج اتنے برسوں بعد اسے رانا شمشیر اور پرنس مظفر اور

یہ سب پرانی باتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ اب جبکہ وہ ایک نئی، زیادہ وسیع بہت مختلف دنیا میں پہنچ چکی تھی اور ــ اور آج جبکہ اس نے اس شخص ــ اس شخص کے ساتھ وا لڑکیا تھا۔ جب وہ اسکول چھوڑ کر عفران منزل واپس آئی اور اس مختلف دنیا کی سوسائٹی میں آنے جانے لگی تو اسے یہ سوسائٹی بہت زیادہ بھائی تھی چنانچہ یہی وہ زندگی ہے جس کے خواب دیکھتے دیکھتے لڑکیاں مری جاتی ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب رنگ برنگے بھیس بدلے ایک فینسی ڈریس کے دیوانے سے ناچ میں تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ زندگی کی وسعتیں۔ یقیناً ــ! اس کا جی چاہتا تھا کہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر، پائن کے جنگلوں میں چھپی ہوئی اپنی پرانی خانقاہ کو واپس چلی جائے۔ وہاں کی ابدی خاموشی، وہ سکون جوان رہبانیت کی وہ خاموش، دردانگیز، تکلیف دہ لذّت اس کار نیول کی رنگین غباروں والی دُنیا سے کہیں زیادہ اطمینان بخش، زندگی کی دھڑکنوں سے کہیں زیادہ قریب، زیادہ صحیح معلوم ہوتی تھی۔ کیسی ہنسی کی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے۔ وہ سوچتی کہ اصلی راحت تو مجھے کہیں بھی نصیب نہ ہو گی۔ بھئی اللہ میں کیا کروں اور دوسرے لمحے پی چو اور کرن اور فیروزا اور گنّی آدھمکتیں اور شام کے لئے پروگرام بننے لگتے تو گویا پھر بھی دُنیا بڑی اچھی، محبّت کے لائق جگہ تھی۔ اس میں پی چو اور پولو اور کرن جیسے پیارے اور مخلص بھائی اور ساتھی تھے۔ گنّی اور ڈائمنڈ اور کرسٹابل جیسی پیاری سہیلیاں تھیں ومل اور فیروزا اور حفیظ احمد جیسے دلچسپ دوست تھے اور ــ اور یہ شخص ــ یہ شخص تھا جس نے اس کے ساتھ والز کیا تھا۔ کیا کیا عجیب باتیں وہ اس وقت سوچے جا رہی تھی۔ انسان جب جذباتی طور پر مضطرب ہو تو غالباً بہت حسّاس ہو جاتا ہے

بڑے عجیب و غریب غیر منطقی خیالات دماغ میں کہیں سے آ گھستے ہیں۔ وہ آوارہ گرد خانہ بدوش — جپسی وائیلڈ کیٹ — مُون اینڈ سکس پنیں — اسے پھر نیند آ گئی
باہر باغ میں صبح کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا اور دُور اکا دکا موٹریں اپنے ہارن بجاتی کہر آلود مال روڈ پر سے گذر رہی تھیں۔

صبح صبح کنور رانی کے کمرے میں بڑی اہمیت سے رشتے دار بیویوں کی کانفرنس شروع ہو گئی پی چو کو کرسمس کی پریڈ کے لئے پولس لائینز جانا تھا۔ اسلئے وہ خلاف معمول جلد اٹھ بیٹھا تھا۔ رخشندہ کی ابھی آنکھ نہ کھلی تھی کہ وہ اندر کو دآیا۔
"روشی پریڈ دیکھنے چلتی ہو؟" اس نے لحاف کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھتے ہوئے کہا
"اوں ہُنک" رخشندہ نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ رات دیر تک جگتے رہنے کی وجہ سے اسے اب تک نیند آ رہی تھی۔
"جانتی ہو کون کون آ رہا ہے؟" پی چو نے پوچھا۔
"تمہاری پریڈ پر؟"
"ارے نہیں۔ گھر پہ بھئی۔"
"کون؟"
"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" پی چو نے پنچم کے سر تک پہنچ کر ایک لمبی تان کھینچی۔
"بھئی پی چو کیا ہے۔ کبھی تو ٹھکانے کی بات کیا کرو۔ کون آ رہا ہے؟"
"اہم۔ نواب جہانگیر قدر۔"

"نواب جہانگیر قدر؟"

"اجی زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔"

"بی چو قسم سے ہم ماردیں گے۔ پوری بات تو بتاتے نہیں۔"

"روشی وہ ممی کے ماموں میاں جو ہیں نواب سلیمان قدر۔ وہ آرہے ہیں مرشد آباد سے۔"

"تو اس میں اتنا اترانے اور شعر پڑھنے کی کیا بات ہے؟"

"جہانگیر قدر جو آرہا ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔

"ارے جبھی تو میں کہوں کہ یہ آدھی رات سے باغ والے بنگلے کی صفائی کیوں کی جارہی ہے۔ مار عباسی خانم اور لالہ بولائے پھر رہے ہیں۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا جناب نور النہار اور جہاں آرا بھی تو آئیں گی ان کے ساتھ"

"ارے پھر تو تمہارے مُنہ میں شکر گھی"۔ بی چو نے خوش ہو کر کہا۔

"شکر گھی نہیں خاک تھوڑی سی۔ راکھ۔ کوئلہ۔" وہ جل کر بولی۔

"ارے تو اتنا جلی کیوں جاتی ہو۔ جہانگیر قدر بھی تو ——"

"اچھا بی چو چپ رہو۔ شرم نہیں آتی۔" اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی۔ ممی بیٹھی بیٹھی جانے کیا سٹر پٹر —— کرتی رہتی ہیں۔

سہ پہر تک مرشد آباد والے آن پہنچے۔ مرشد آباد اور مٹیا برج والوں سے کنور رانی کے گھرانے کے پرانے تعلقات اور دُور کی رشتے داری تھی۔ ان تعلقات کو قائم رکھنے والے بڑے کنور صاحب اور بڑی بہو بیگم کب کی ختم ہو چکی تھیں

لیکن نواب سلیمان قدر اگلے وقتوں کے آدمی تھے۔ پرانی وضعداری کو نبھائے جاتے تھے۔ کلکتے یا مرشدآباد سے وہ جب بھی لکھنؤ آتے۔ ہمیشہ غفران منزل بھی ملنے آتے تھے جہانگیر قدر پہلے کبھی غفران منزل نہ آیا تھا۔ دارجیلنگ اور کلکتے میں تعلیم ختم کرنے کے بعد نیوی میں شامل ہو کر وہ سمندروں پر چلا گیا تھا اور اب لڑائی کے بعد مرشدآباد واپس آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عباسی خانم کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ اے ہے ماشاءاللہ سے ابھی لفٹین ہے۔ پھر کپتان ہو جاوے گا۔ اس سے اچھا کون ہے۔ اپنا دیکھا بھالا گھر کا لڑکا" عباسی خانم کے بار سمجھایا ہے کہ نیوی میں کپتان اتنی جلدی نہیں ہو جاتے" رخشندہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اے تو خاک پڑے رہیں کیا جانوں تمہاری نیوی سیوی۔ پر مجھے تو بچہ بہت بھایا ہے۔ ماشاءاللہ سے کیا مٹر مٹر باتیں کرتا ہے"۔ وہ پائنچے سنبھالتی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ رخشندہ چپکے سے غسل خانے کے راستے نکل کر "لالہ رخ" بھاگ گئی۔

جانے کس طرح سے یہ خبر ہیڈکوارٹرز سے نکل کر دوستوں کے سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ کرن نے ہڑبڑا کر نیشنل ہیرلڈ کے دفتر سے فون کیا۔ "روشی سُنا ہے کہ غفران منزل میں بڑے زوروں سے پردکھوے ہو رہے ہیں۔ یہ ٹھاٹھ ہیں بھائی۔ پہلے سے خبر نہیں ملی۔ ورنہ سلیم کو تعزیت کا لوکل تار بھیج دیتے۔ اور سنا ہے۔ کنور رانی کل امیرپور ہاؤس گئی تھیں تو ڈون انوردی گریٹ سے پوچھتی تھیں کہ بھیّا تنک تم ہو تبہو تم کا ہمرا جہانگیر قدر نیک لاگا کی ناہیں۔!"

"ہم مار دیں گے کمرن"۔ رخشندہ کو اس مضحکہ خیز صورت حال پر رونا آ گیا۔

مرشدآباد والوں نے ایران میں شادیاں کی تھیں۔ اس لئے ان لوگوں میں

ایران کی صباحت اور بنگال کی ملاحت دونوں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ جہانگیر قدر یا تو بنگالی بولتا تھا یا فارسی۔ انگریزی بولنے پر جب آتا تو لگتا تھا کلکتہ ایکسپریس کا انجن سرپٹ نکل بھاگا۔ کھانے کی میز پر آکر اکثر رخشندہ ہی کو اس کی ترجمانی کرنی پڑتی۔ اس کا جی چاہا۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں کو نکل جائے۔

وہ لوگ چار پانچ دن تک ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں ایک روز سلیم عفران منزل آیا۔ اُس نے دیکھا رخشندہ بڑے اطمینان سے جہانگیر قدر کے سامنے بھی وہی مکمل میزبان بنی ہوئی ہے۔ اس سے کہہ رہی ہے۔ آپ فیض آباد چلئے تو ہم آپ کو شکار کے لئے لے جائیں۔ آج کل ترائی میں خوب نیل گائیں اور مرغابیاں ملیں گی ——

مرشد آباد والے ابھی عفران منزل ہی میں تھے کہ سالِ نو آن پہنچا۔ لالہ رخ میں سالِ نو کی دعوت تھی۔ کرسٹابل اور حفیظ نے جہانگیر قدر اور اس کی دونوں بہنوں کو مدعو کیا۔ دوستوں کی ساری قوم جمع ہوئی۔ دھیرے دھیرے کرسٹابل کا خوبصورت ڈرائینگ روم مہمانوں سے پُر ہونا شروع ہوا۔ سیاہ ڈنر سوٹوں میں ہنری فونڈا اور کلارک گیبل جیسے مرد، راجکماری اندرا اور پرنسس دُرِ شہوار جیسی خواتین ایسے لوگ جن کے نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں اور سول لسٹ کے اوّلیں صفحات پر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جو کرسمس کا زمانہ کلکتے میں اور گرمیاں کشمیر میں بسر کرتے ہیں اور جن کی بیویاں ان سے طلاق لے کر سوئٹزرلینڈ چلی جاتی ہیں جگمگاتے انسانوں کے اس مجمع سے ذرا دور کونے میں رکھے ہوئے اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے شیڈ کے اندھیرے میں وہ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی چپ چاپ

بیٹھی تھی۔ نئے مہمان داخل ہوتے۔ کرسٹابل یا حفیظ خان کا نام اناؤنس کرتے اور پھر وہ اِدھر اُدھر اپنے دوستوں کے حلقے میں جا بیٹھتے ساس کے پاس کوئی نہیں آیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی اپنے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ خوبصورت نظر آنے کی کوشش کرتی رہی۔

"ارے بھئی ہلو" وینبیز اکیڈمی کی مشہور و معروف اور بے حد اسمارٹ پرنسپل مس زینت ریاض نے اس کے قریب آکر کہا۔

"ہلو، بیٹھئے۔ شکر ہے کہ کوئی بات کرنے والا تو ملا۔ صدیوں سے بیٹھی اکتا رہی ہوں۔"

"کیوں؟ تم نے خود ہی اپنے کسی ہمسائے یا ہمسائی سے گفتگو شروع کر دی ہوتی۔ یوں بیک گراؤنڈ میں کبھی نہ رہنا چاہیئے۔" انہوں نے اسے گر بتایا۔ "دیکھو ابھی غفران منزل کا سٹ نہیں پہنچا۔ تم ان سے ملنا۔ بڑے اچھے لوگ ہیں خصوصاً چھوٹا کنور اور اس کا نووارد دوست ــــ"

"ہوگا۔ فی الحال تو مجھے ان میں سے ایک بھی ڈھنگ کا آدمی نظر نہیں آیا کیا یہی ہے تمہاری مشہور معروف اونچی سوسائٹی"۔

"نہیں ان میں سے بعض بعض لوگ بہت اچھے ہیں۔" زینت ریاض نے کہا۔ "تم ابھی یہاں کسی کو نہیں جانتی ہو۔ اس لئے ایسا لگ رہا ہے۔" چونتیس سال چار ماہ کی ہو چکنے کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی قلب و نظر کی وسعت آ گئی تھی اور وہ انسانوں کی بہت سی خامیوں کو نظر انداز یا معاف کرنے کیلئے تیار تھیں پی چو نے زناٹے سے کار لا کر برساتی میں روک دی۔ کرسٹابل بھاگی

باہر گئی۔ گنی وغیرہ کی پوری پارٹی رخشندہ کے ساتھ آئی تھی۔ کرسٹابل نے برآمدے میں جا کر چپکے سے ان سے کہا "سنو بھئی آج بڑے بڑے پر تکلف قسم کے اور شریف لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا تم سب قاعدے سے بی ہیو کرنا۔ کھانے کے بعد جب یہ لوگ کھسک جائیں گے تو گپ رہے گی۔"

"اچھا" رخشندہ نے کہا "بھئی گنی ڈائمنڈ پی چو کرن تم سب لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بی ہیو یور سلیف کرنا۔ آیا خیال شریف میں۔"

"اچھا" وہ بھی مان گئے۔

ہنری فونڈا اور شہزادی دُرِّ شہوار جیسے انسانوں کے اس پُر تکلف مجمع میں ان ہی کی طرح بیٹھ کر نپی تلی فلسفتی ایبل باتیں کرنا ان میڈ ہیٹرز کے لئے بڑا صبر آزما کام تھا۔ لیکن گنی اور ڈائمنڈ ایک طرف کو بے حد شرافت سے بہت ہی اخلاق کی باتیں کرنے لگیں۔ رخشندہ دوسری طرف انتہائی سنجیدہ شکل بنائے ایک صاحب سے جن کی بے حد تاریخی مونچھیں تھیں۔ بڑی پولیٹیکل گفتگو کرتی رہی۔ اُدھر تسنیم، پی چو، کرن اور رومل نے ایسے منہ بنا لئے گویا میلاد شریف سُن رہے ہیں۔

کچھ دیر تک یونہی گاڑی چلا کی۔

"اُفوہ بھئی سلیم ہم سے تو اب زیادہ بی ہیو یور سلیف نہیں کیا جاتا۔ سخت اسٹرین پڑ رہا ہے۔" رخشندہ نے چپکے سے کہا۔ سلیم اس کے نزدیک قالین پر بیٹھا چند خواتین کو ہاتھ دیکھنے کے مشغلے سے محظوظ کر رہا تھا۔ ڈائمنڈ نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "روشی چلو ذرا باہر ٹھنڈی ہوا کھا آئیں تو کچھ جان میں

جان آ گئے۔ پی ہیو کرتے کرتے مصیبت آ گئی۔"

جب وہ سب قہوے کی پیالیاں لینے کے لئے پینٹری کی طرف جا رہی تھیں اس وقت رخشندہ نے اس گھنگھریالے بالوں — اور چمپئی رنگت والی لڑکی کو دیکھا جو بے حد کوشش سے بن بن کر کچھ لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھی۔

"ارے یہ تو وہ مشہور عالم شہلا رحمٰن ہیں جو شاعرہ ہیں بڑی بھاری۔ اردو انگریزی اور جانے کون کون زبانوں میں شاعری فرماتی ہیں"۔ پی چو نے اچھل کر چپکے سے گنّی سے کہا۔

"بھئی یہ کون چیز ہیں۔ پی چو تمہیں دنیا جہان کی خبر رہتی ہے۔ کون شاعری فرماتا ہے۔ کون گھاس کھودتا ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

سب لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جانے لگے جہانگیر قدر سلیم سے باتیں کر رہا تھا۔ رخشندہ اس کے پاس آئی۔ "چلو بھئی لفٹیننٹ صاحب کھانا آ گیا"۔ اس نے جہانگیر قدر سے کہا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مجمع میں جا شامل ہوا سلیم ایک لحظے کے لئے وہیں پر ٹھٹھکا اور پھر اطمینان سے سگریٹ سلگاتا گیلری کی طرف مڑ گیا۔

رخشندہ نے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ گیلری میں پہنچ کر رکا۔ اس نے مڑ کر رخشندہ پر نظر ڈالی۔

وہ خاموشی سے اپنی کالی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے کہتی ہو۔ کیا تم ہم سے خفا ہو نہیں ناراض نہ ہونا چاہئے۔ ارے تم تو بے وقوف ہو بالکل۔ چلو کھانا کھانے۔

ڈائننگ روم کے مجمع میں ایک صاحب اپنی مونچھوں کی وجہ سے سب سے

ممتاز نظر آتے تھے۔ مونچھیں کیا تھیں گویا ناک میں مرغی کا پر۔ آدھا ادھر آدھا اُدھر۔ پڈنگ نوش کرتے کرتے ان کی مونچھ بچہ کہاں کو بھاگی جاتی تھی۔ کسٹرڈ کا ایک قطرہ چپک گیا اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ یہ اس قدر روح افزا نظارہ تھا کہ رخشندہ جو کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ اور رنجیدہ کھڑی پڈنگ ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ارے ڈائمنڈ گنی اوما جلدی آنا۔" اُس نے کہا۔ وہیں ٹہل ٹہل کر کھانا کھاتے ہوئے فوراً چند فی البدیہہ اشعار نازل ہوئے جن کا مطلع الوار تھا۔ میری پیاری مونچھو کدھر جا رہی ہو۔ لڑکیوں کی کھسر پھسر نے پی چو کو متوجہ کر لیا۔ یہ تم لوگوں کی کیا بُری عادت ہے کہ جہاں چند لڑکیاں اکٹھی ہوئیں اور آپس ہی میں کھی کھی شروع کر دی ہمیں بھی بتاؤ کیا واقعہ ہے۔ اب غور کرنے والا مقام یہ تھا کہ صاحب قصیدہ تو وہیں ٹہل رہے تھے۔ ان کی موجودگی میں بھلا کیا بتایا جاتا اور اوپر سے بی ہیو لیو سلف کرنا پڑ رہا تھا۔ ہنسی سے دوہرے ہوتے ہوئے رخشندہ اور گنّی نے پی چو اور کرن کو برآمدے میں لے جا کر وہ پورا سانیٹ سنایا۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے آدھ فٹ اچھل پڑے "ذرا یہ بی ہیو یور سلف کرنے والے لوگ چلے جائیں تو ڈرائینگ روم میں چل کر یہ قصیدہ سنایا جائے گا۔" پی چو نے کہا۔ "ارے ہائے خدا کے لئے یہ غضب نہ کرنا۔ سب کہیں گے۔ کیا دیوانی لڑکیاں ہیں۔" رخشندہ گھبرا کر بولی۔

معزز مہمانوں کے جانے کے بعد جب صرف بے تکلف دوست رہ گئے تو پی چو نے انتہائی ترنم کے ساتھ اس نظم سے حاضرین کو مستفید کیا۔ کمرے میں

ایک طوفان آگیا۔ حالات نارمل ہونے پر سب اسی طرح اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے
شہلا رحمٰن اسی طرح بڑے تکلف سے دیوان پر بیٹھی تھی۔ اس لڑکی میں کچھ خصوصیت
تھی۔ وہ سب سے علیحدہ نظر آ رہی تھی اور رخشندہ نے جو کنور عرفان علی کی بیٹی تھی۔ فوراً
یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکی ایک دوسرے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دنیا سے
نکل کر وہاں آئی ہے جو 'بورژوا' ہوتے ہوئے 'ارسٹوکریسی' کی حدیں چھو لینے کی
کوشش میں ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس لڑکی
کو 'اسٹابلش' اور 'پوش' بننے کی کوشش میں مصروف دیکھ کر اس نے اس کی بیک
گراؤنڈ کا ایک مڈل کلاس گھرانے کی اس کائنات کا تصور کرنا چاہا۔ جہاں سے
وہ آئی تھی۔ ایک مڈل کلاس گھرانا جس کے ڈرائینگ روم وینس اور نیپلز کے رنگین
مناظر کے پرنٹ اور لارڈ بائرن اور ڈانتے اور بیترس کی چھپی ہوئی تصویروں سے
مزین ہوتے ہیں اور جہاں کے لڑکے شام کو بے حد اہتمام سے سفید براق
پتلونیں پہن کر رفاہ عام کلب ٹینس کھیلنے جاتے ہیں اور لڑکیاں گریجویٹ کہلانے
کی تیاری کرتی ہیں اور جن کی مائیں نوجوان ڈپٹی کلکٹروں کو چاء پر مدعو کرتی ہیں کہ
دیکھو ہماری پڑھی لکھی کالج کی تعلیم یافتہ بیٹیاں تمہارے گھروں میں جا کر تمہارے
کمروں کو بھی اسی طرح چھپی ہوئی تصویروں اور کڑھے ہوئے نمبرا اور چینے کے خرمیوں
سے سجا دیں گی۔ یہ ٹریجک مڈل کلاس، اسے اس لڑکی سے یکلخت بڑی ہمدردی
محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا۔ وہ سلیم سے کہے، جاؤ ذرا اس سے باتیں کرو۔ کم از کم
اس کا ہاتھ ہی دیکھ دو۔

لیکن سلیم جب چاپ صوفے کا سہارا لگائے قالین پر بیٹھا سب کے ہاتھوں

کی لکیریں ہی دیکھے جا رہا تھا۔

دعوت کے اختتام پر جب سب باہر نکل رہے تھے۔ گھنگھریالے بالوں والی شہلا رحمٰن نے دروازے کے قریب امیر پور کے انور اعظم کو دیکھا۔ ارے یہ تو وہی ہے جس نے فیض آباد میں چچا میاں کے گھر کے آگے جانے کیوں کار روک دی تھی اور پھر آگے چلا گیا تھا۔ واقعی اتفاقات بھی کیا ہوتے ہیں۔ کہاں سے کہاں لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ بہت سی باتیں اُس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔ یہ شاندار دعوت، یہ خوش باش، دلچسپ، الٹرا فیشن ایبل لوگ۔ یہ چہکتی مہکتی لڑکیاں جو مونچھوں پر نظمیں کہتی ہیں اور — اور — یہ سانولا، انوکھا مغرور، سیاہ آنکھوں اور لمبی پلکوں والا شخص جو محض سب کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ ان سب احساسات و تاثرات کو الگ الگ یاد کر کے وہ دماغ میں محفوظ کر لے گی اور نظموں کے مسالے میں یہ سب کام آئے گا۔

انور نے جب اسے سیڑھیوں پر تنہا کھڑے دیکھا تو اخلاقاً اس کے پاس آ کر کہنے لگا: "آپ اپنے دولت خانے تشریف لے جائیے گا؟"

"جی۔"

"آپ کے ڈرائیور کو آواز دوں؟"

"اوہ — جی نہیں شکریہ۔ مجھے مس ریاض کا انتظار ہے۔" اُس نے غیر یقینی سے لہجے میں کہا

"اوہ۔ بہت اچھا۔ شب بخیر۔" وہ آگے چلا گیا۔

گنتی اور فیروزا اندر سے نکلے۔

"بھئی گنی ڈارلنگ مس رحمٰن کو تم پہنچاتی جاؤ" کرسٹابل نے آکر کہا۔
"ضرور۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟" گنی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔
لیکن جہاں وہ رہتی تھی۔ وہ اتنی فلیشن ایبل جگہ نہ تھی جس کا نام وہ اطمینان سے لے دیتی۔ "کچہری روڈ" اس نے آہستہ سے کہا۔
"ارے کرن تو ادھر سے ہی گذرے گا۔ کرن بھئی یہاں آنا" گنی نے آواز دی
کرن نے برساتی میں آکر فوراً بے حد اخلاق سے اپنی اوپل کا دروازہ کھول دیا۔
جب وہ کرن کے ساتھ بیٹھی لالہ رخ کے پھاٹک میں سے نکل رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سلیم موٹروں کے قریب کھڑا زعفران منزل والوں سے باتیں کر رہا تھا
اندھیرے میں اس کی آنکھیں زیادہ پُراسرار زیادہ سیاہ معلوم ہو رہی تھیں۔
راستے میں کرن اپنے فطری بے تکلف اور پر خلوص طریقے سے اس سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ الہ آباد میں آپ فلاں فلاں کو جانتی ہیں۔ آپ کو ہماری بہنیں پسند آئیں۔ آپ ہمارے رسالے نیو آیرا کے لئے بھی ضرور کچھ لکھئے
گھر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کے دروازے بند کئے اور وہ کھڑکی کھولی جس کا رخ چھتر منزل کی طرف تھا۔ حالانکہ چھتر منزل وہاں سے نظر نہ آتی تھی کیونکہ بیچ میں روشن الدولہ کی کچہری کی سرخ عمارتوں کا طویل سلسلہ حائل تھا۔
لیکن بہر حال، رات کے سناٹے میں گومتی کی طرف سے ہوائیں تو آ جاتی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ پہلی جنوری کی رات ہے اور گومتی کی ہوائیں بہت سرد ہوں گی
اُس نے کھڑکی بند کر دی اور لیمپ سرہانے رکھ کر، کیونکہ آنکھوں سے نیند ابھی بہت دُور تھی۔ اُس نے لکھنا شروع کیا: ــــــ

نیچی نظروں بولے ڈولے، اونچی نظروں چپ چاپ رہے
نیچی نظروں بولے ڈولے۔

تب قمر آرا کا تانگہ لاٹوش روڈ اور قیصر باغ کے چوراہے سے گذرتا موتی محل برج پر پہنچا۔ جہاں سے یونیورسٹی کی دنیا شروع ہوتی تھی۔ اس وقت گھوڑا ہوا تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس کی وجہ سے تانگے پر جو فرخ آباد کا چھپا ہوا نیروزی پلنگ پوش بندھا تھا۔ وہ اڑا جا رہا تھا اور اس اڑتے ہوئے پردے میں سے کیا نئی عجیب وغریب، خوبصورت، طلسماتی دنیا نظر آرہی تھی۔ شفاف، سایہ دار سڑک جس پر طالب علموں کی سائیکلوں اور موٹروں کے علاوہ اور کوئی ٹریفک ہی نہ تھا۔ سرسبز گھاس کے میدان، یونیورسٹی کے بے تحاشا شاندار عمارتوں کے اونچے اونچے گنبد اور مینار اور شہ نشین سائیکلوں پر سوار ازابلا تھوبرن کالج اور یونیورسٹی کی انگریز اور ہندوستانی لڑکیاں جن کے بال اور آنچل اس کے تانگے کے قریب سے زن سے نکلتے ہوئے ہوا میں اڑے جاتے تھے۔ یونیورسٹی روڈ پر سے مڑ کر ازابلا تھوبرن کالج کے آگے سے گذرتے بادشاہ نگر کی سڑک کی دھول اور دھچکے کھاتے وہ اور چودھری اصغر علی بالآخر کرامت حسین گرلز کالج کے پھاٹک میں داخل ہوئے اور وہ مسلم اسکول میں شامل ہو گئی۔

یہ مسلم اسکول ایک نئی دنیا تھی۔ ان اونچی سفید دیواروں اور جھروکوں کے اندر ایک الف لیلیٰ ایسی بستی آباد تھی۔ وہاں عجیب وغریب باتیں اس نے دیکھیں کلاس ہی استانیوں کو لڑکیاں گلاب کے پھول پیش کرتیں۔ صبح صبح باغ میں جا کر

اپنی پسندیدہ استانیوں کے لئے گجرے تیار کئے جاتے جس طرح کی نئی ساریاں یا
سینڈلز ٹیچرز پہنتیں، دوسرے روز ان کی پرستاروں کے گروہ اسی رنگ
کے لباس میں نظر آتے۔ رات کو اسمبلی ہال میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور مشاعرے
کئے جاتے۔ اتوار کے روز لڑکیوں کے بھائی ان سے ملنے آتے۔ نصیبن آپا جو
اپنی ذات سے انجمن تھی۔ اندر آکر چلّاتی۔ فلاں فلاں بٹیا چلو کوئی جنے تم سے
ملنے آئے ہیں۔ وہاں چوڑیوں، تحفوں اور آپس کی محبتوں کا بڑا زور تھا۔ یہ
پردے میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی کائنات تھی اور لڑکیاں جو زیادہ تر پردے دار
متوسط طبقے کے خاندانوں سے وہاں آتی تھیں۔ اسی کائنات کی چہار دیواری میں
اپنے شوق پورے کرنے کی کوشش کر لیا کرتی تھیں۔ قمر آرا جس زندگی سے نکل کر
وہاں آئی تھی۔ وہاں چودھریوں کے اس محلے میں پردے دار آنگنوں صحنچیوں اور
ڈیوڑھیوں میں چپکے چپکے ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ مہریوں یا نائنوں کے ذریعے
کاپی کے کاغذوں پر نہایت زوردار قسم کے محبت نامے بھیجے جاتے تھے۔ جن
میں خودکشی، چاندنی راتوں کی یاد اور اسی قسم کی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا جو مسلم
سوشل فلموں میں دکھائی جاتی ہیں۔ لڑکیاں جن کے رشتے کے بھائی چھٹیوں میں اپنے
اپنے کالجوں سے مانا ٹھیر، ردولی یا سندیلے آتے تھے۔ آپس میں مذاق کرتیں
فلاں بھائی جان اور فلاں بھیّا کا نام لے لے کر چھیڑا اور شرمایا جاتا۔ بعض صاحبزادیاں
اس میدانِ عشق میں اتنی نبرد آزما ثابت ہوئی تھیں کہ باورچی خانے کے چاقو کے ذریعے
انگلی میں سے خون نکال کر اپنے اپنے ہیروؤں کو خط لکھ چکی تھیں۔ وہ ان سب
[illegible] دیکھنے کی عادی تھی۔ لیکن یہاں اس کالج میں ان باتوں کے بجائے

آپس ہی میں محبت نامے چلتے تھے اور ایک دوسرے پر مرا جاتا تھا۔

قمر آرا یہاں بہرحال خوش تھی۔ مانا ٹھیر کی چھوٹی حویلی کی قید با مشقت سے آزاد ہو کر اس نے پہلی بار چین کا سانس لیا تھا۔ یہاں آتے ہی وہ پرنسپل کے دفتر سے غفران منزل فون کر کے رخشندہ بجیا کو اطلاع دے چکی تھی کہ وہ لکھنؤ آ گئی ہے اور رخشندہ بجیا اتنی اچھی تھیں کہ فوراً اگلے اتوار کو کار بھجوا کر انہوں نے اسے غفران منزل بلوا لیا تھا اور اس سے کہہ رکھا تھا کہ اب کے سے غفران منزل میں اگر کوئی "پردہ پارٹی" ہوئی تو اس میں اس کو ضرور آنا پڑے گا۔

قمر آرا بہت خوش تھی۔

ایک روز جبکہ جمعہ کی آدھے دن کی چھٹی تھی اور لڑکیاں سفید آڑے پاجامے اور اپنے اپنے "ہاؤسوں" کے رنگوں کے دوپٹے پہنے کھیل کے میدان میں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں نصیبن ٹیچرز بلڈنگ کے برآمدے میں آ کھڑی ہوئی اور اپنی مخصوص جناتی آواز میں چلائی "قمر بٹیا تمہرے بھیّا آئے ہیں"۔ قمر آرا دباسکٹ بال کے لئے اپنی ٹیم ترتیب دے رہی تھی۔ یہ اطلاع سن کر اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ کیا بھائی میاں آ گئے۔ اس نے جلدی سے بالوں کی لٹیں دوپٹے میں سمیٹیں اور چنبیلی کی کیاریوں کو پھلانگتی ٹیچرز بلڈنگ کی طرف بھاگی۔

"کیسے ہیں۔ گورے گورے سے ہیں؟" اس نے نصیبن کے پاس پہنچ کر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

"نہ گورے نہ کچھ کالے ایسے ہیں تمہرے بھیّا"۔ نصیبن نے ہاتھ چلا کر کہا اور زردہ پھانکتی اطمینان سے آگے چلی گئی۔ قمر آرا کے قدموں کی رفتار بہت سست پڑ گئی

سلیم دفتر کے سامنے برآمدے میں کھڑا وقت گذاری کے خیال سے نوٹس بورڈ پڑھ رہا تھا۔ رخشندہ نے پیغام رسانی کی یہ اچھی مصیبت اس پر ڈالی تھی۔

"اوہ —" ایک بالکل جانے کون آدمی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر قمر آراء ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آداب عرض۔"

"تسلیمات"

"رخشندہ کی کزن قمر آرا بیگم آپ ہی ہیں؟"

"جی۔"

"رخشندہ بیگم نے یہ کہلوایا ہے کہ وہ اس اتوار کو آپ کو غفران منزل نہ بلوا سکیں گی۔ کیونکہ انہیں کہیں باہر جانا ہے۔"

"اچھا آپ — آپ رخشندہ بجیا کے —"

"جی، وہ میری دوست ہیں۔"

قمر آرا چپ ہو گئی۔ واہ بھئی۔ رخشندہ بجیا بھی کوئی لڑکا ہیں جو آپ اس مزے سے کہہ رہے ہیں کہ وہ میری دوست ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔

"اچھا آداب عرض"۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر باہر کھڑی ہوئی کار میں جا بیٹھا اور آگے روانہ ہو گیا۔

قمر آرا باسکٹ بال کے لئے اندر واپس چلی گئی۔

کنور رانی صبح سے بہت پریشان تھیں۔ امبر پور والوں نے پھر با دہانی کروائی

تھی کہ کنور انور اعظم کے لئے جو پیام ہم مدت گذری بھیج چکے ہیں۔ اس کا صاف جواب دیجئے۔ ادھر میں نہ رکھئے تاکہ ہم کہیں اور فکر کریں۔ لڑکے کی عمر جاتی ہے اس کے علاوہ در پردہ اُن کا یہ مطلب بھی تھا کہ جمیلہ بیگم کی نسبت ہوئے اتنے دن ہونے آئے۔ اس کا قصہ بھی نپٹا دیجیے۔ ایک دفعہ بات طے ہو چکی ہے گویا کا معاملہ ہے۔ ہم دیر نہیں کرنا چاہتے۔ کنور رانی اسی سوچ میں تھیں۔ لفٹنٹ جہانگیر قدر کا مسئلہ بھی ان کے سامنے موجود تھا۔ انہوں نے کنور صاحب کو اوپر سے بلوایا۔ کنور صاحب عجب مگن آدمی تھے۔ انہیں تو جیسے فکر ہی نہ تھی کہ لڑکی ان کے لاڈ پیار میں تئیں چوبیں برس کی ہوا چاہتی ہے۔ کوئی بادشاہ بھی اپنی بیٹی کو گھر پہ نہیں بٹھا سکا۔ آپ کب تک یونہی قانون شیخ میں کھوئے رہیئے گا۔ کنور صاحب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور پھر اپنے دارالمطالعے کی طرف چلے گئے۔

"ایسے مردوئے کے ساتھ نوج کوئی جھک مارے۔" کنور رانی نے غصے سے اپنے خوبصورت سر کی جنبش کے ساتھ کہا اور اپنی صحنچی میں آبیٹھیں۔

اسی وقت کہیں سے گھومتے پھرتے چودھری شمیم آن ٹپکے۔

"کہئے چودھرائن۔ نصیب دشمناں آپ کا تو جی ماندہ نظر آتا ہے۔" انہوں نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا میں تو ان بچوں کی فکروں میں تنکے چننے لگوں گی۔" انہوں نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

"کیوں۔ مرشد آباد والوں کے سلسلے میں رخشندہ بیگم کی کیا رائے ہے۔"

"پتہ نہیں۔ وہ جانیں ان کے چہیتے بھیا بابا جانیں۔"

"میں سمجھا" چودھری شمیم نے کہا
"اس وقت مانا ٹھیر سے آتے ہو؟" کنور رانی نے کچھ وقفے کے بعد بات کا رُخ بدل کر پوچھا۔
"جی ہاں"
"وہاں سب خیریت ہے؟"
"بالکل صرف قمر آرا بیگم مسلم اسکول میں داخل ہونے کے لئے تشریف لے آئی ہیں"۔
"ہاں وہ تو میں جانتی ہوں قمر آرا پچھلے اتوار کو یہاں بھی آئی تھی"۔
"ابھی جب میں غضنفران منزل آتا تھا تو راہ میں مجھے امبر پور ہاؤس کے مختار عام میاں مرتضےٰ حسین ادھر سے جاتے نظر آئے۔ کیا کچھ پھوپی میاں کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی ہے؟" چودھری شمیم نے پہلو بدل کر خالص رشتے داروں کے سے انداز میں خاندانی سیاست پر روشنی ڈالنی چاہی۔
"مرتضیٰ حسین انور کے لئے کہتے تھے" کنور رانی نے مختصراً جواب دیا۔
"انور کے لئے؟ غضب خدا کا۔ ارے صاحب میں نے خود اپنی آنکھوں سے انور اعظم کو، اسے کیا نام اس کا، کون روز کو جو بارہ بنکی میں ناچی تھی۔ اپنی موٹر میں بٹھائے لئے جاتے دیکھا ہے۔ کیا کہتی ہیں۔ کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجئے گا۔ لوفر لڑکا ہے بالکل" [چود]ھری شمیم نے بڑے تشویشناک انداز میں کہا۔
کنور رانی چپ چاپ بیٹھی ڈلی کاٹا کیں۔ انہیں چودھری شمیم کی رائے سے اتفاق تھا کہ انور اعظم لوفر لڑکا ہے قطعی ہو گا۔ لیکن اس لحاظ سے لوفر کون نہیں

ہوتا خود کنور صاحب اور بڑے کنور صاحب جنّت مکانی خدا ان کی روح کو نہ شرمائے اپنے اپنے زمانوں میں کسی سے کیا کم تھے۔ کلکتے والی گوہر اور روتی والی چھمیا کے قصے کس کو یاد نہیں لیکن زخشندہ جس معیارِ زندگی کی عادی تھی وہ مرشد آباد کے لٹے ہوئے نوابوں یا کسی اور ملازمت پیشہ گھرانے میں اس معیار سے نہ رہ سکتی تھی۔ وہ خوب روپیہ خرچتی تھی۔ انور کے پاس گاؤں گراؤں سبھی کچھ تھا اور وہ اس کے لئے بے غل وغش روپیہ اٹھا سکتا تھا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے بھی سب سے مقدّم ہے۔

خاصے کے بعد چودھری شمیم نے کنور رانی سے اجازت چاہی اور سوچا کہ اب امبر پور ہاؤس کا رُخ کریں۔ تاکہ وہاں کے تازہ ترین حالات سے واقفیت ہو۔ چودھری شمیم ان دنوں ایک فلم کمپنی قائم کرنے کی مہم میں لڑا رہے تھے اور اس کے لئے انہیں بہت سارے روپے کی ضرورت تھی۔ وہ اسی خیال سے عفران منزل تشریف لائے تھے کہ کنور صاحب کے ہاتھ اس کے حصے فروخت کرنے کی کوشش کریں لیکن اس وقت کنور رانی اپنی ہی پریشانیوں میں مبتلا بیٹھی تھیں اور کنور صاحب کے سامنے جانے کی انہیں ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اپنا ہیٹ اٹھا کر وہ اپنی پرانی فورڈ میں آ بیٹھے جو انہیں اپنے والد سے چند گاؤوں کے ساتھ ورثے میں ملی تھی۔

چودھری شمیم ہرفن مولا آدمی تھے۔ کنور رانی سے ان کی بہت دور کی رشتہ داری تھی۔ کئی سو روپے ماہوار کی زمینداری تھی۔ جس سے گذرتی تھی۔ لیکن خالی بیٹھنا نہ جانتے تھے۔ پولٹری فارمنگ اور لیگ کی لیڈری سے لے کر فلم پروڈکشن تک

سب طرح کے کاروبار پر طبع آزمائی فرما چکے تھے اور فی الحال اس کوشش میں تھے کہ چودھری اصغر علی کی لڑکی قمر آرا سے اگر ان کی شادی ہو جائے تو خورشید چونکہ لاپتہ ہے۔ چودھری صاحب کی ساری جائداد ان ہی کے ہاتھ آئے گی۔ اس کے علاوہ بیگم اصغر علی کو جو پچھتر روپے بارہ آنے وثیقہ ملتا تھا۔ وہ ان کے بعد ان کی لڑکی کو ملے گا۔ پھر راوی چین لکھتا ہے۔ لیکن اس ربیع الاوّل میں ان سے شادی رچانے کے بجائے قمر آرا تو مانا ٹھیر سے صفحان بچ کر مسلم اسکول پہنچ چکی تھی اور یہ مسئلہ بڑا غور طلب اور پریشان کن تھا لیکن اس وقت تو وہ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اپنی فورڈ پر سوار چلے جاتے تھے کہ دیکھئے اب اس انور کے قصے کا کیا ہوتا ہے

چودھری شمیم کی فورڈ تھوڑی دیر بعد امبر پور ہاؤس کی سرخ برساتی میں جا رکی۔ ہارن بجانے پر سیروں گہنے پاتے پہنے ایک گدبدی سی مہری باہر آئی۔

"انور میاں ہیں؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"بھیّا اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔"

"کوئی اور بھی ہے ان کے پاس؟"

"جی ہاں جمیل میاں تشریف رکھتے ہیں۔" مہری نے جواب دیا اور کڑے بجاتی کوندے کی لپک کی طرح گیلری کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

امبر پور راج کے انور اعظم کو رات کی نیند سے بیدار ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی وہ صوفے پر نیم دراز جمیل کے ساتھ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا رہا تھا۔

"اوہو! یہ تو چودھری صاحب چلے آتے ہیں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آداب بجا لاتا ہوں حضور۔" اس نے چودھری شمیم سے کہا۔

"تسلیمات۔ بندگی" وہ ہیٹ فرش پر پھینک کر برابر کے صوفے پر آ بیٹھے۔
"کہئے۔ سرکار آپ کی فلم کمپنی کیا کہتی ہے؟" انور نے پوچھا۔
"اجی فلم کمپنی کو گولی ماریئے۔ یہاں تو مبارکباد پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں قبلہ"۔
"مبارکباد کا ہے کی۔ میاں تمہارے منہ میں شکر گھی۔ جلد بتاؤ"۔
"ہم یوں نہ بتائیں گے مٹھائی سامنے رکھو پہلے"۔
"واللہ تمہیں جناب امیرؓ کی قسم بتاؤ تو سہی کیا خبر ہے"۔
"خبر ہے؟ اب یوں نہ اڑیئے قبلہ"۔
"ارے بندۂ خدا ارشاد تو کرو"۔
"آپ تو گویا بسم اللہ کے گنبد سے نکلے چلے آتے ہیں کچھ جانتے ہی نہیں"
"ارے بھائی اتنی لمبی تمہید اٹھائی ہے تو کچھ کہو تو سہی"۔
"سرکار زعفران منزل سے چلا آتا ہوں"۔
"خوب۔۔خوب۔۔ آگے فرمایئے" جمیل جلدی سے کان کھڑے کر کے متوجہ ہو گیا۔ لیکن انور اعظم جب تک چودھری شمیم وہاں موجود رہے خاموش رہا
"خوب شے ہیں آپ بھی۔ خود جانے کس چکر میں ہیں اور یہاں آ کر یہ شگوفہ چھوڑ گئے"۔ ان کے جانے کے بعد انور نے کہا۔
"پارٹنر اگر ان کی یہ چنڈو خانے کی روایت صحیح ہے تو قصہ تو دلچسپ رہے گا" جمیل بولا۔
انور پھر صوفے پر لیٹ گیا اور دھوئیں کے حلقے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

ابھی دو گھڑی دن باقی تھا اور کلب کا وقت بہت دُور تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں ایسا ایسا رئیس پڑھتا ہے۔ جس کی دو دو سال محض پرکسی سے حاضریاں لگتی ہیں۔ لیکن وہ خود اپنے تعلقوں سے تشریف لاکر کلاس میں شرکت کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا جب کوئی اچھا فلم آیا یا یونین میں کسی دلچسپ قسم کی ہٹر لوننگ کا امکان ہوا تو مزے سے اپنی کار لے کر آ گئے۔ ہبوٹ یا بٹلر ہوسٹل میں دوستوں کے کمرے میں ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔ امتحانات وغیرہ لینے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی کیا فکر۔ اپنے صبح نو بجے کے قریب جاگے امیبسڈر میں جاکر ہاتھ منہ دھویا اور چاء نوش کی۔ جی چاہا تو ایک آدھ کلاس جھانک لی۔ لیڈیز روم کے برآمدوں کے سامنے سے کار میں بے نیازی سے دو تین چکّر لگائے اور پھر سدا بہار حضرت گنج کے کسی کافی ہاؤس میں رات کے نو بجے تک رونق افروز رہے۔ یونین کے جلسوں میں بنیٹ ہال یا اے۔ پی سین ہال میں سب سے پیچھے سب سے زیادہ شور مچانے والے گروپ کے ساتھ جا بیٹھے یا اوپر جاکر کھڑکیوں میں سے نیچے جھانک کر مزے مزے کے فقرے کستے رہے آنرز اور ایم اے اور لا کی ساری ممکن کلاسیں ختم کرلیں تو پھر ریسرچ میں نام لکھا لیا تاکہ یونیورسٹی کی دلچسپیوں سے قانونی طور پر تعلق باقی رہے۔ امیر پور کا انوار عظیم انہیں رئیسوں اور "اولڈ ٹائمرز" میں سے تھا۔ برساتیں میں وہ بھی اپنے تعلقے پر چلا جاتا۔ گرمیوں میں مسوری کی سیر کرتا۔ اسکیٹنگ اور سوئمنگ میں وقت گذارتا اور پھر جی بھر کے تفریحیں کرلینے کے بعد بڑی معصومیت سے سوچتا۔ یہ بھی زندگی کا ایک PHASE تھا۔ مجھے اس موقعے پر، اس وقت یہی رول ادا کرنا تھا۔

اور یہ طے کر لینے کے بعد وُہ امبر پور ہاؤس کے دفتر میں بیٹھ کر ریاست کے کسانوں کی بہتری اور بہبودی کی اسکیمیں بنانے میں مشغول ہو جاتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے ٹکنیکل طور پر اچھا انسان کہا جا سکتا ہے۔ جب وُہ ڈُون اسکول سے واپس آیا تو اُس نے امبر پور میں یہ افواہ سُنی کہ اماں بیگم کنور ہا راج اس کی بات لئے جاتی ہیں۔ رخشندہ ان دنوں نینی تال میں پڑھ رہی تھی۔ پی چُو اور پو لو کو بھی وہ اچھی طرح نہ جانتا تھا۔ لکھنؤ کے لا مارٹینیز کالج میں کچھ عرصے اس کا اور پی چُو کا ساتھ رہا تھا۔ لیکن امبر پور ہاؤس اور زعفران منزل والوں میں آپس میں زیادہ گہرے تعلقات کبھی نہ رہے تھے۔ اس لئے اسے رخشندہ کو دیکھنے کا موقعہ بہت کم ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے دلکشا کلب یا سوسائٹی کے کسی ڈرائینگ روم میں نظر آجاتی تھی۔ اسے بڑے ہو کر یہ یاد بھی نہ رہا تھا کہ امبر پور ہاؤس والے اس کی 'بات' لے کر زعفران منزل گئے تھے۔ دیوے کے میلے میں اس نے رخشندہ کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا۔ پھر اس نے سنا کہ چچی بیگم نے کنور رانی کے سامنے یہ شرط رکھی ہے کہ ہم پی چو میاں کا رشتہ جبھی منظور کریں گے۔ جب آپ رخشندہ بیگم کے لئے ہماری بات مان لیں گے۔ لاحول ولا۔ کیا حماقت کی یہ سیاست تھی۔ اسے اس سیاست سے بالکل کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اسے یہ لڑکی بہت پسند ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے دل کی اچھائی کی وجہ سے اس کی پرستش تک کرنے کو تیار تھا۔ اگر اسے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ اس کی ذرا سی بھی پرواہ کر لے گی کیونکہ اس نے کہیں سے خورشید کا قصہ سن رکھا تھا۔ حالانکہ بڑے گھر کی بات بہت جلد چھپا دی جاتی ہے۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ رخشندہ انتہائی ضدّی،

خود سر اور مغرور لڑکی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی بات پر اڑ جائے تو ساری زعفران منزل اسے منانے کے لئے رات بھر ایک ٹانگ پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شہر کے تازہ وارد ڈون ثنوان ڈاکٹر سلیم کا ہر اتوار کو اپنے ضلع سے بھاگا بھاگا آنا خالی از علّت نہیں لیکن اپنے دل کی اچھائی کی وجہ سے اس نے ڈاکٹر سلیم سے جلنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کا عزیز ترین دوست صرف جمیل تھا۔ جو زیادہ تر علی گڈھ میں رہتا تھا۔ علی گڈھ میں جانے کس علت میں تھا۔ اسے ایم ایس سی وغیرہ کئے صدیاں گذر گئی تھیں۔ اب جانے وہ ریسرچ کر رہا تھا یا مقابلوں کی تیاری یا غالباً گرلز کالج میں فزکس کا لیڈی لیکچرر ہو گیا تھا۔ یونین کے الیکشن لڑانے میں اس سے زیادہ ماہر دور دور تک کہیں نظر نہ آسکتا تھا اور وہ میرس روڈ اور ڈگی اور نقوی پارک اور گرلز کالج کے چکر لگایا کرتا تھا اور حد سے زیادہ نون سیریس رہتا تھا۔

وہ دونوں صوفے پر اکتائے ہوئے بیٹھے رہے۔ شام کی چاء کے ساتھ مہری نے شام کی ڈاک حاضر کی۔ دوسرے خطوط کو کھول کر دیکھنے کے بعد انور اعظم کی نظر ایک بڑے سے خوبصورت لفافے پر پڑی جو کشتی میں سب سے نیچے رکھا تھا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کھولا:۔

"ظاہر ہے کہ میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ تم مجھے پسند ہو۔ کرسمس اور سال نو کی مبارک باد پہنچے۔

کوئین روز"

ایک لحظے کے لئے اس نے جمیل کو اس طرح دیکھا۔ گویا اب وہ یقیناً کسی بڑے

سنسنی خیز، سو فیصدی بولتے گانے ناچتے بہترین سین سینریوں والے فلم کا ہیرو بننے والا ہے۔

"بڑے لطیفے کی لونڈیا ہے۔ مانتا ہوں" جمیل نے کہا۔ صورت حال پر اس سے زیادہ ڈھکانے کا ریویو اس کی سمجھ میں اس وقت نہ آیا۔

انورِ اعظم نے وہ لفافہ بے پروائی سے قالین پر ڈال دیا اور کلب جانے کیلئے تیاری کرنے لگا۔

"پارٹنر میرا فلسفہ تو اس وقت یہ کہتا ہے کہ کلب جانا اب جھول ہے" جمیل نے کہا

"پھر کیا کیا جائے" انورِ اعظم نے تجاہل عارفانہ سے کام لے کر پوچھا۔

"بس ذرا کھڑے کھڑے اس کرسمس کارڈ کا شکریہ ادا کرتے آئیں۔ کیا خیال ہے؟"

"خاصہ"

"تو پھر چلو"

"لیکن یہ یاد رہے مولانا کہ دادا ابا آج کل امبرپور سے تشریف لائے ہوئے ہیں"

"اماں تو ہم کو ئی اس کا، کیا نام آیوی کورٹ کا قبالہ لکھوانے جانے ہیں بس ذرا اخلاق کا تقاضا ہے کہ کرسمس کارڈ ـــــ"

"جہنم میں جائے تمہارا کرسمس کارڈ، چلو میں چلتا ہوں"

انورِ اعظم کی نیلی ٹوسیٹر چند لمحوں بعد اپنی روایتی برق رفتاری کے ساتھ کلائیڈ روڈ اور مال پر سے گذر کر بیرو روڈ پر آگئی۔

وہ آیوی کورٹ کے قریب پہنچ گئے۔

پھاٹک کے سامنے پہنچ کر اس نے بیفکری سے کار روک دینی چاہی (بلکہ

اس نے اطمینان کے ساتھ سیٹی بجانے کا بھی ارادہ کیا۔ لیکن اس کے بجائے جمیل بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ چھپ چھپ کے مت دیکھیو جی ہمنوا جی، کی دھن میں سیٹی بجا رہا تھا) اس نے طے کیا وہ کہے گا۔ گڈ ایوننگ مس مک گریگر۔ ہیپی نیو ایئر۔ آپ کے پیارے پپا اور جم کیسے ہیں ___

لیکن دفعتہً کیا ہوا کہ اس نے زور سے ایکسلریٹر دبایا اور کار آگے بڑھا دی جمیل نے جب محسوس کیا کہ آیوی کورٹ کی روشن دو منزلہ عمارت اندھیرے میں پیچھے رہی جا رہی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اچک پڑا۔ ارے بھئی۔ وہ تو ___ تم تو آگے نکل آئے یار میرے"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"سیدھے کلب چلو" انور نے جواب دیا

"کیوں ___ اماں یہ کیا وحشت ہے ___ ایں ؟"

انور اعظم خاموش رہا۔

"واللہ یعنی اس کی کیا تک ہے یعنی ؟" جمیل نے انتہائی جھنجھلاہٹ کے ساتھ احتجاج کیا۔

انور اعظم نے اسی خاموشی کے ساتھ سہ راہے پر پہنچ کر مال واپس جانے کے لئے کار موڑ دی۔

اور جب وہ آیوی کورٹ کے سامنے سے دوبارہ گذر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ ان کی لو سیٹر کی سامنے کی روشنیاں اندھیرے میں ایک دوسری کار پہ پڑیں جو اسی سمے وہاں پہنچی تھی اور اس میں سے اتر کر وہ شخص سلیم بیفکری سے رومال سے ناک چھوتا ہوا، پھاٹک کے اندر چلا گیا۔ اندر جہاں سے پیانو اور گٹار کی

آوازیں آرہی تھیں اور غالباً کیرل گائے جا رہے تھے اور روشن دریچوں میں کاغذی قندیلیں اور رنگین غبارے ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"غالباً یہ بھی زندگی کا ایک دور ہے ——— کیوں۔ استاد؟" جمیل نے بڑی شکستہ دلی کے ساتھ ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

جنوری کے سرد، تاریک آسمان پر مدھم ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

کوئی گڑیاں یا کھچڑی یا اسی قسم کے کسی تہوار کی ایک دن کی چھٹی تھی۔ اس میں سلیم پرتاب گڑھ سے لکھنؤ آیا۔ عفران منزل پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پی چو کے سٹنگ روم میں تو مہت ہی فکر مند شکل بنائے بیٹھی ہے۔ گنتی بہتی چولہے پر بے حد اہتمام سے کو کو تیار کر رہی تھی۔ ڈائمنڈ اور واتا کسی ٹیبی دسالے پر جھکی ہوئی تھیں۔ اندر رخشندہ کے کمرے میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ "کیا قصہ ہے بھئی۔ پی چو کہاں ہے؟" اس نے ڈائمنڈ سے پوچھا۔

"ارے ڈوک روشی بیمار پڑ گئی ہے۔ پی چو ڈاکٹر لینا دینا کر کو بلانے گیا ہے" ڈائمنڈ نے جواب دیا۔

"رخشندہ بیگم کو کیا ہو گیا؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ اتنے میں پی چو آن پہنچا۔

"ارے یار تم آ گئے۔ ہم نے بیکار ہی میں ڈاکٹر لینا دینا کر کو بلایا۔ روشی بچاری کو تھوڑا سا فلو ہو گیا ہے۔ لالہ رخ کی دعوت سے واپس آتے ہی اسے ٹھنڈ اور منچھو والے صاحب قصیدہ کی بد دعا لگ گئی۔" پی چو نے بشاشت سے اطلاع دی۔

"یہ ڈاکٹر لیناآدیناکر کون بزرگ ہیں؟" سلیم نے چپکے سے گنّی سے دریافت کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی کوئی مرہٹی نام ہوگا۔ جیسے جیسے ٹم ٹم کر، بھاؤ چکا دجی گھوڑ پاٹرے، پدگاموجی وزگم پھالکے ـــ کرن نے اندر سے آواز دی۔ "ارے بھئی سلیم خاں آجاؤ بھئی ـــ"

وہ رخشندہ کے کمرے میں پہلی بار داخل ہوا۔ کرن ایک آرام کرسی پر بیٹھا نیو آیرا کے لئے آئے ہوئے مضامین پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رخشندہ چپ چاپ تکیوں کے سہارے بیٹھی ـــ چہرہ ہاتھوں پر ٹکائے غور سے سن رہی تھی اور منہمہ ـــ بورژ ـــ گرینڈ ـــ ٹرلشن کہتی جا رہی تھی۔ پردوں میں سے چھنتی ہوئی روشنی میں وہ بالکل زرد نظر آ رہی تھی جس طرح میڈونا کا چہرہ قربان گاہ کی شمعوں کے دھندلے اجالے میں پراسرار اور زرد دکھائی دیتا ہے۔

"ارے ہلو ڈوک" ـــ رخشندہ نے بشاشت سے کہا۔

"ہلو تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے بھئی" ـــ سلیم نے کہا۔ کمرے کی بے حد گھریلو اور آرام دہ فضا اسے انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ وہ دریچے کے نزدیک جا کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر لیناآدیناکر آ گئے" ـــ پی جو نے دریچے میں سے اندر جھانک کر سب کو مطلع کیا۔

"ارے ہائے" ـــ گنّی نے سلیم کو مخاطب کیا۔ "بھئی ڈاکٹر صاحب لیونا سے ابھی آئے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ لکھنؤ میں تمہاری جگہ پر تھے۔ اصل میں لیناآدیناکر یہ وہ ڈاکٹر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کا پورا نام

لفٹنٹ کرنل کمار اپا راؤ لیناد ینا کہ یہ وہ مہا بلیشوری رکھ چھوڑا ہے اور ان سے کہہ رکھا ہے کہ اب کے سے اپنے پیڈ پر بھی یہی نام مفصّل چھپوا لیتے گا۔ بچارے بہت اچھے آدمی ہیں۔ مگر انہیں مانتے۔ رخشندہ کو تو انھوں نے بیٹی بنا رکھا ہے۔ پی جو کہتا ہے کرنل مجھے بھی بیٹا بنا لو۔ نہایت سعادت مند ثابت ہوں گا تو وہ کہتے ہیں کہ تم بیحد شیطان ہو تمہیں ہرگز بیٹا نہ بناؤں گا اور رخشندہ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کی شادی پر اسے کنیا دان کے طور پر بہت بڑھیا بڑھیا چیزیں دیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب اندر آئے۔ بیحد دلچسپ انسان تھے۔ کوئی بات کہہ کر چاروں طرف اس طرح دیکھتے۔ گویا داد طلب کرتے ہوں کہ کیسی رہی۔ فرمانے لگے "بس رخشندہ بیٹی اب تم یہی دوا پی جاؤ۔ دوسرا نسخہ میں لکھے دیتا ہوں اور کیا لینا دینا یہ وہ"۔ پی جو نے کہا "کرنل زکام تو مجھے بھی ہونے والا ہے اور ویسے مستقل ایک مہینے سے عشق میں مبتلا ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری بات کی بالکل سُنی ان سُنی کر کے جواب دیا "ہاں ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آج کل موسم بدل رہا ہے۔ زکام کھانسی لینا دینا یہ وہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ تو کہو تم نے صبح ہی مجھے فون کر دیا۔ ورنہ لینا دینا یہ وہ بڑی مشکل پڑ جاتی۔ میں اب تک ہسپتال نکل گیا ہوتا"۔

"کرنل ہمارے ایک نئے دوست سے ملو۔ آپ آج کل پرتاب گڈھ میں سول سرجنی فرماتے ہیں"۔ کرن نے سلیم کا تعارف کرایا۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو اس قدر مسرت ہوئی۔ گویا وہ عمر بھر سے اسی مژدہ جانفزا کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ "اوہو تو آپ پرتاب گڈھ میں ہیں۔ خوب خوب بھئی

ملنا جلنا لینا دینا یہ وہ ہوتا ہی رہے گا۔" انہوں نے سلیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے حد خوشی سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد کنور رانی کمرے میں آئیں۔ کرن نے کھڑے ہو کر آرام کرسی فوراً ان کے لئے مسہری کے قریب رکھ دی۔ سلیم نے کنور رانی کو آج پہلی مرتبہ دیکھا۔ کنور رانی واقعی بڑی شاندار ہوتی تھیں۔ کرسی پر بیٹھی اس وقت وہ بالکل اگلے وقتوں کی مہارانی معلوم ہوتی تھیں اور درخشندہ سے یقیناً بہت زیادہ حسین تھیں۔

اپنے دلکش انداز سے سر اٹھا کر کنور رانی نے کرن سے پوچھا۔ "تم لوگن کو آج کوئی خاص کام تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں خالہ بیگم آج تو گڑیوں کی چھٹی ہے۔" ڈائمنڈ نے کہا۔

"اچھا تو تم سب دن بھر یہیں بیٹھے رہنا۔ بٹیا کا جی بہلا رہے گا۔" انہوں نے کہا۔

تھوڑی دیر کمرے میں ٹھہر کر وہ اپنے شاہانہ انداز سے اٹھیں اور پھر اندر چلی گئیں سب کی جان میں جان آئی۔

کچھ دیر بعد کرن نے سلیم سے کہا۔ "بھئی اگر تم چپ چاپ مراقبے میں بیٹھے رہنے کی بجائے روشی سے باتیں کرتے رہو تو میں ذرا پل جو کے کمرے میں جا کر دو ہاتھ مار لوں۔"

"کیا کر لو؟" سلیم نے پوچھا۔

"ارے کرن کا مطلب یہ ہے کہ ذرا دو گھڑی سو لے بیچارہ۔" ڈائمنڈ نے جواب دیا۔

سلیم کو ہنسی آ گئی۔ "تم لوگوں کی زبان اور اصطلاحیں سمجھنے کے لئے مجھے کوئی تھامس ڈکشنری دیکھنی پڑے گی۔" اس نے کہا۔

"ہاں کرن بھیا۔ تم اب جا کر آرام کرو۔ سویٹ گڈو کل سے اپنی پریس کانفرنس کے قصے میں تھک رہا ہے اور اب صبح سے یہاں بیٹھا بور ہو رہا ہے۔" رخشندہ نے کہا۔ "ڈوک ضروری نہیں کہ تم باتیں کرتے رہو۔ میں بالکل نہیں اکتاؤں گی۔" اُس نے سلیم کو مخاطب کیا۔

کرن اُٹھ کر جمائیاں لیتا پی چو کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔

پھر یکایک جانے کیا ہوا کہ وہ اس تکلیف دہ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ دوپہر کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ ڈائمنڈ ریکارڈوں کا پروگرام اناؤنس کرنے کے لئے سائیکل اٹھا کر ریڈیو اسٹیشن بھاگ گئی۔ گنی باہر سٹنگ روم میں بیٹھی نیو آیرا کا اڈیٹوریل لکھنے میں مشغول تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا باتیں کرے۔ بس وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے ـــ بہت دور چلا جائے۔ پرتاب گڈھ ـــ طہران ـــ سماٹرا ـــ

رخشندہ نے پھر ایک مکمل میزبان کی حیثیت سے اس سے باتیں شروع کرنی چاہیں لیکن اُس نے دیکھا کہ وہ تو جنگلی بلے کی طرح چپ بیٹھا ہے۔

"پی چو اب تک ڈاکٹر لیناڈ بیناکر کو پہنچا کر واپس نہیں لوٹا"۔ بالآخر رخشندہ نے کہا۔

"ہم۔ اب تک واپس نہیں لوٹا۔" سلیم نے بات دہرا دی۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ارے بھئی ڈوک۔ ایک بڑے مزے کا قصہ سنو۔" کچھ وقفے کے بعد رخشندہ نے پھر گفتگو جاری رکھنے کی سعی کی۔ "تم کل نہیں آئے۔ کل بے حد لطف آیا۔ پی چو کہیں سے ایک حیدر آبادی شاعر کو پکڑ لایا۔ وہ اپنے لئے وظیفہ حاصل کرنے کی غرض سے

میاں سے ملنا چاہتے تھے تو ڈوک انہوں نے۔۔۔ ڈوک سن رہے ہو؟"

"ہاں ہاں"

"تو انہوں نے ایک سجع لکھا تھا۔ کوئی صاحب حیدرآباد کے ان کے سرپرست تھے۔ سر آسمان جاہ بشیر الدولہ۔۔۔ تو انہوں نے ان کے لئے سجع لکھا۔ "تم آسمان کی جاہ ہو سر دولہ بشیر الہ۔۔۔ ہم تم کو بھی دیکھا ہے" ۔۔۔ بھئی ڈوک تم سن ہی نہیں رہے ہو قصہ۔"

"رخشندہ ۔۔۔ رخشندہ" وہ چلّا کر وہاں سے بھاگ جائے ۔۔۔ اس طرح وہاں بیٹھا نہ رہے ۔۔۔ جیسے وہ اتنا بیوقوف ہے۔ وہ چپ چاپ دیوان پر بیٹھا اپنی کالی پلکیں جھپکاتا رہا۔

وہ حیدرآبادی شاعر کا لطیفہ سنانے میں مصروف رہی۔

ارے رخشندہ ۔۔۔ تم اتنی خوبصورت ۔۔۔ اتنی مقناطیسی کیوں ہو۔ تم اپنے سفید، چھوٹے چھوٹے، ایرانی بلّیوں کے ایسے ہاتھ کشن پر رکھ کر اس طرح کیا کیا کہے جا رہی ہو ۔۔۔ تمہاری کالی آنکھیں اپنی خاموشی میں کیا کیا سناتی رہتی ہیں۔ تم جن الف لیلوی محرابوں میں سے نکل کر آئی ہو۔ ان محرابوں، ان جھروکوں کے پیچھے کون سے اسرار پنہاں ہیں، جن کی وجہ سے، جن کے اثر سے تم اتنی مغرور، اتنی الگ تھلگ، سب سے اتنی مختلف نظر آتی ہو۔ تم جو اتنے اخلاق سے اس حیدرآبادی شاعر کا قصہ سنا رہی ہو۔ میں اسے بالکل نہیں سننا چاہتا۔ جہنّم میں جائیں تمہارے سر آسماں جاہ ۔۔۔ یہ لڑکی جو اس سفید، برفیلی مسہری پر کشنوں کے سہارے لیٹی تھی۔ یہ مجسمہ جو کنوارپن کی تقدیس اور مکمل عورت پن کی الوہیت کے اس امتزاج نے تیار کیا تھا۔ یہ مجسمہ جو

صدیقہ مریم اور روبنیس ڈی میلو کا امتزاج تھا۔ یہ مریم کی سی تقدیس والی لڑکی، مریم سے جس کی نسوانیت کے مکمل نزین تصور کے آگے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لڑکی سے اس نے صرف اتنا کہا ـــ بھئی واہ۔ بڑے دلچسپ تھے وہ صاحب۔ بڑا افسوس ہے کہ میں ان سے نہیں مل سکا۔ ورنہ ذرا تفریح رہتی۔"

رخشندہ نے دل میں کہا: "اوہ اتنا بنتا ہے یہ آدمی کہ بھئی حد ہے۔" آخر اس نے اکتا کر گنتی کو آواز دی۔ لیکن گنتی سٹنگ روم میں مضمون لکھتے لکھتے وہیں سو چکی تھی۔

"ڈوک اگر تم بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو تو تم بھی پی جی کے کمرے میں جا کر ذرا چار کے وقت تک کے لئے آرام کر لو۔ ہم اکیلے میں بالکل نہیں اکتا رہے گے۔" اس نے کہا۔

"ہاں رخشندہ میرے خیال میں اب تمہیں کچھ دیر سو لینا چاہئے۔" اس نے بالکل ایک مکمل ڈاکٹر کی طرح اسے پروفیشنل اور طبی مشورہ دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

جب وہ غفران منزل سے جا چکا تھا تو شہلا رحمٰن رخشندہ کی مزاج پرسی کے لئے وہاں آئی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اس کے آنے سے کچھ دیر قبل وہاں سے گیا ہے۔ وہ بڑی محبت اور اخلاص سے رخشندہ کے پاس بیٹھی رہی۔ لیکن رات گئے تک بھی سلیم واپس نہیں آیا۔ وہ غالباً دلکشا کلب جا چکا تھا اور شہلا رحمٰن کے گھر کا کوئی فرد بھی دلکشا کلب کا ممبر نہ تھا جو وہ بھی وہاں جا سکتی۔ کچہری روڈ کے سارے وکیل اور ایڈووکیٹ رفاہِ عام کلب جاتے تھے۔ دلکشا کلب صرف آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے سینئر عہدیداروں اور اسی قسم کے دوسرے اعلیٰ افسروں اور تعلقداروں کے لئے مخصوص تھا۔

اس دوران میں وہ رخشندہ سے کئی مرتبہ مل چکی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہ کر جو غور کیا تو اُسے معلوم ہوا تھا کہ وہ خود بھی خوبصورت ہے اور کافی انٹلکچوئل بھی یعنی یہ دو باتیں عموماً ایک ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ اسے سیاسی اور ادبی بحثیں آرٹ اور فلسفے پر گفتگو اور اس طرح کی باتیں بہت پسند تھیں۔ وہ سوچا کرتی۔ کاش کبھی ایسا ہوتا کہ وہ مشہور اور تقریباً مشہور قابل لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی دلچسپ باتوں میں شریک ہوا کرتی۔ غفران منزل میں اس نے دیکھا کہ وہ مشہور شخصیتیں جن کا اس نے صرف تذکرہ سنا تھا یا ان کی کتابیں اور تصویریں دیکھی تھیں یا ریڈیو پر ان کی آواز سنی تھی۔ وہ سب یہاں جمع رہتے۔ سن شیڈز کے نیچے اور پی چہ کے سٹنگ روم میں اور باغ کے درختوں تلے وہ سب کتنا اچھا وقت گذارتے۔ ان سب کی ایک برادری سی معلوم ہوتی۔ پھر یہ ارسٹو کریسی تھی۔

رخشندہ کو یہ لڑکی پسند آئی تھی۔ اس کی تخیل پرستیاں، اس کے اشعار، اس کی زندگی کا وہ مخصوص بیک گراؤنڈ۔ یہ سب چیزیں رخشندہ کو بہت مزیدار معلوم ہوتیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے لکھا ہو "جاپانا" یا "گلاس" "ہولڈ وِد کیر"

پھر ایک روز شام کے وقت سنہلا رحمٰن غفران منزل آئی۔ عباسی خانم نے باہر آکر بتایا کہ رخشندہ بٹیا ابھی میرس کالج سے اپنی کلاسیں لے کر واپس نہیں لوٹی ہیں اور پی چہ اور ٹپو بھیا بھی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ رخشندہ کا انفلوئنزا ٹھیک ہوگیا تھا اور وہ پھر اپنے مشغلوں میں مصروف ہو چکی تھی۔ غفران منزل کے باغ پر سورج ہمیشہ کی طرح ایک ہی سے دنوں پر طلوع ہو رہا تھا۔ وہ واپس چلی جاتی لیکن

بہت سہانا وقت تھا۔ ڈرائیو پر اندھیرا چھا رہا تھا اور پی جو کے سٹنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ کر ان سب کا انتظار کرنے لگی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے اس کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں۔ شام کے جھٹ پٹے میں یہ الف لیلےٰ ایسا محل اپنے سپنوں میں کھویا ہوا بڑا اسندر لگ رہا تھا لیکن جاز کا ایک نغمہ اُسے یاد آیا۔ میرے پاس حسن ہے۔ میرے پاس دولت ہے مجھے اور کیا چاہئے۔ مجھے اور کیا ـــ

برساتی میں ایک کار آکر رکی اور وہ آن پہنچا۔

وہ ہفتے میں ایک دو بار ہمیشہ غفران منزل آتا تھا۔ وہ طے کر لیتا تھا کہ اب کے سے وہ ہرگز وہاں نہ آئے گا۔ آگ کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھے گا۔ اس کے قریب بیٹھے گا بھی نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا تھا کہ آٹھ دن نہ گذرنے پاتے تھے کہ انہیں بھاری دبیز پردوں، مخملیں کشنوں نیز سرخ گلاب کے شگوفوں اور اسٹوو پر سے اٹھتی ہوئی قہوے کی بھاپ کے انتہائی تکلیف دہ ماحول میں اپنے آپ کو پھر موجود پاتا تھا۔ وہ اسی طرح انلان کی گفتگو میں مصروف رہتی پی جو اور کرن اسی طرح قہقہے لگاتے۔ ڈائمنڈ اسی طرح تازہ ترین فلموں کے گیت پیانو پر بجاتی۔

ایک ننھی لڑکی کو دیوان پر انڈین لسنر کے ورق پلٹتے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے سٹنگ روم کے دروازے میں ٹھٹھکا۔

"اوہ ـــ اوہ ـــ آیئے" نہایت شدت سے شہلا رحمٰن نے محسوس کیا کہ اب یقیناً کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ وہ لمحہ بالآخر آن پہنچا جس کی یاد اسے غالباً

جنم بھر ستائے گی۔" میں — میں شہلا رحمٰن ہوں۔" اُس نے ذرا جھجک کر کہا۔

"جی — مجھے معلوم ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "سالِ نو پر میں آپ کو لالہ رُخ میں دیکھ چکا ہوں۔"

"آپ تشریف رکھیے۔ رخشندہ بیگم اور سب لوگ ابھی آتے ہی ہوں گے۔" لیکن اس کے کہنے سے پہلے ہی اندر آ کر وہ اپنے مخصوص صوفے پر اطمینان سے بیٹھ چکا تھا شکر کہ اس نے مجھے کہیں اور مثلاً گھر کے اس کمرے میں نہیں دیکھا۔ جسے چچی بیگم بڑے ارمانوں سے ڈرائینگ روم پکارتی ہیں یہ پس منظر بہت ہی ٹھیک تھا دیواروں پر روغنی تصویروں کے نقوش اندھیرے میں مبہم ہوتے جا رہے تھے۔ باہر باغ میں شام کی ہوا یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ آتشدان کے مصنوعی کوئلے ہیٹر کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ سلگتے، سنسناتے تاروں کے نیچے۔ اُس نے اپنے ذہن میں لکھنا شروع کیا۔

"کیا آپ رخشندہ بیگم کے ساتھ پڑھتی ہیں؟" کمرے میں صرف دیوار کی ایک روشنی مدھم سا اجالا بکھیر رہی تھی۔ سلیم نے بے تکلفی سے اٹھ کر اسٹینڈرڈ لیمپ روشن کر دیا اور اپنی جگہ پر واپس جا کر بیٹھنے کے بعد ظاہر تھا کہ محض کوئی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"جی نہیں" — بات وہیں ختم ہو جاتی۔ اس لئے اس نے فوراً آگے کہنا شروع کیا: "ہم دونوں کالج میں کبھی اکھٹے نہیں رہے۔ لیکن اتفاق سے رخشندہ کے اور میرے مذاق قریب قریب بالکل یکساں ہیں۔"

"واقعی۔" اس نے پھر پائپ منہ میں رکھ لیا۔

"رخشندہ کو مجھ سے ملتے بہت کم عرصہ گذرا ہے۔ لیکن ہم نے ڈسکور کیا ہے کہ اسے بھی وہی چیزیں پسند ہیں جو مجھے اچھی لگتی ہیں اور پائدار دوستی کے لئے ہم مذاقی ظاہر ہے کہ کتنی ضروری ہے۔"

"جی ہاں۔ ظاہر ہے۔"

"مثلاً رخشندہ موسیقی پر جان دیتی ہے اور مجھے بھی موسیقی بے حد پسند ہے۔"

"خوب۔"

"لیکن مغربی کلاسیکل موسیقی سے مجھے کوئی شغف نہیں جس پر رخشندہ مرتی ہے اور انگریزی میوزک ہال کی چیزیں پسند کرنا ہبسکے نزدیک صریحاً بدمذاقی ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ تو ہے ہی۔"

"دیکھئے نا ڈاکٹر صاحب۔ دراصل جب تک ہم اس مخصوص بیک گراؤنڈ، ایک بالکل اجنبی قوم کے تمدنی پس منظر سے کسی قسم کی فطری ہم آہنگی نہ رکھتے ہوں۔" — اس نے ہاتھ ایک خاص خوبصورت انداز سے ہلا کر کہنا شروع کیا۔

وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ بڑی بکواسی لونڈیا ہے۔ جانے کیا کیا کہے جا رہی ہے۔ تمدنی پس منظر سے فطری ہم آہنگی۔ وہ بڑی کوشش سے منہ سے پائپ ہٹا کر جی ہاں واقعی، قطعی، میرا بھی یہی خیال ہے کہتا رہا۔

یہ عجیب انسان، جس کی کالی لانبی پلکیں اس کی سوتی سوتی آنکھوں پر کس بے پروائی سے جھکی رہتی تھیں۔ درحقیقت اس کے اتنے قریب بیٹھا تھا اور وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اتنی انٹلکچوئیل گفتگو جاری رکھنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ پھر رخشندہ اور اس کی سہیلیاں آجائیں گی۔ شور مچنا شروع ہوگا۔ اور وہ لازمی طور پر بیک گراؤنڈ

میں چلی جائے گی چنانچہ اس نے اسی خوبصورت، اور پولشڈ انداز میں باتیں جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے نیو آیرا میں غالباً اب تک کچھ نہیں لکھا؟"

"نیو آیرا میں؟" وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ "جی نہیں"۔ اس نے جواب دیا "آپ نے اس کا کوئی پرچہ بھی غالباً اب تک نہیں دیکھا؟ یہ انگریزی رسالہ ہم لوگوں نے ترقی پسند مقاصد سامنے رکھ کر پچھلے دو سال سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔

دراصل یہ رخشندہ کی بولی ہے"۔ وہ صرف ایک ڈیڑھ مہینہ قبل لکھنؤ آئی تھی۔ لیکن اس نے اس طرح اس بے ساختگی اور بے پروائی سے ذکر کیا کہ ہم لوگوں نے پچھلے دو سال سے یہ رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے"۔ گویا وہ ہمیشہ سے عفران منزل والوں کے سٹ میں شامل رہی ہے۔

"بہت نفیس رسالہ ہے۔ رخشندہ اور کرن کے کہنے پر اس کے پہلے ہی پرچے میں پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی، ڈاکٹر علیم، پروفیسر رادھا کمل مکرجی وغیرہ نے مضامین دئے تھے"۔ وہ کہنے لگی۔ ان باتوں کا تذکرہ اس نے رسالے کے پہلے اڈیٹوریل میں پڑھا تھا۔

"جی۔ بہت ہی نفیس رسالہ ہے۔ میں ضرور اس کو پڑھا کروں گا"۔

"آپ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی سے ملے ہیں؟ بیورلی نکلس نے اپنی "ورڈکٹ اون انڈیا" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں اسے صرف ایک انٹلکوئل نظر آیا اور وہ ہے پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی"۔

"اچھا واقعی؟ — غالباً آپ بھی تو انگریزی میں شاعری کرتی ہیں"۔ اس نے کچھ دیر بعد گھڑی پر نظر ڈال کر کہا (رخشندہ اور پی جو آ ہی نہیں چکتے۔ اس نے دل میں سوچا)

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحے سنبھل کر وہ بے حد اخلاقاً ہنسی۔ "جی ہاں میری کچھ نظمیں بمبئی کرانیکل اور ٹرینڈ وغیرہ میں شائع ہو چکی تھیں تو کمل نے کہا کہ تم ہمارے پرچے کے لئے بھی کچھ ضرور لکھو۔" اس نے محسوس کیا کہ وہ بمبئی کرانیکل کی بجائے پینگوئن نیو رائیٹنگ کا نام بھی لے دیتی تو وہ بالکل متاثر ہوئے بغیر اسی طرح بیٹھا پائپ پیتا رہتا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ وہ ساری کا آنچل اپنے گرد لپیٹتے ہوئے دیوان پر سے اٹھی گیلری میں گئی اور میز پر ایک خاص انداز سے جھک کر ریسیور اٹھایا۔ چتر منزل کلب سے کسی نے پی۔ جی کو رنگ کیا تھا۔ فون پر بات کرتے ہوئے دفعتہ اس نے محسوس کیا کہ اس انداز میں ایک ہاتھ میں ریسیور اٹھا کر سر ذرا ایک طرف کو نیہوڑائے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن ہیٹ ریک کا آئینہ وہاں سے بہت دور تھا اور دوسرے سرے پر بات ختم کی جا چکی تھی۔

جب وہ سٹنگ روم میں واپس آئی۔ اس وقت تک اپنے دوستوں کا انتظار کرتے کرتے اکتا کر وہ باہر برآمدے میں جا کھڑا ہوا تھا۔

ہندوستانی موسیقی کی جھنکار سے یونیورسٹی میں شام کا وقت بہت دلچسپ ہوتا ہے قیصر باغ کے وسیع ہرے گھاس کے قطعوں کے پرے، نواب سعادت علی خاں اور ان کی بیگم کے پرانے فلک بوس سیاہ گنبدوں والے مقبروں کے سہلٹ کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں آسمان کو گلرنگ کر دیتی ہیں۔ کالج کی عمارت کے چاروں طرف بکھرے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیوں کی مدھم آوازیں اور موسیقی کی لہریں

گونج لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی جاتی ہے اور بہت سے سازوں، بہت سے راگوں کی آوازیں مل جل کر فضا میں پھیل جاتی ہیں اور عمارت کے برآمدوں میں کھڑے ہوئے پرانے مجسمے چپ چاپ اپنی بے نور آنکھیں جھپکتے ہوئے ان پراسرار آوازوں کو سنتے رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں پر ایک ایسا سکوت لرزتا ہے جو لگتا ہے ذرا سا گہرا سانس بھی لینے سے دفعتہً منتشر ہو جائے گا۔

وہ اسی سحر انگیز سکوت کے زیر اثر چاندنی پر ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی اگلے پیریڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ کلاس روم خالی پڑا تھا۔ برابر کے کمرے میں کتھا کلی کی کلاس ہو رہی تھی ——————— زرینہ کے بول مدھم سروں میں ایک ہی لے کے ساتھ دہرائے جا رہے تھے۔ اس کی نورتھ ایریہ کی لڑکیاں باہر جا چکی تھیں اور پانچویں سال کی لڑکیوں کے پیریڈ میں ابھی وقفہ تھا۔ تان پورہ اس کے سامنے اوندھا پڑا تھا۔ لیکن اگلی کلاس کے لئے اسے ٹیون کرنے کی غرض سے وہ اس کے تاروں پر انگلی نہ پھیر سکی۔ ارے جنے میں کیسی سنگیت وشارد ہوں۔ باؤلی سی دوسروں کو دیوتاؤں کے راگ سکھاتی اور سمجھاتی ہوں اور خود ایک انسان کے کنول نینوں کے راگ نہیں سمجھ پائی۔ ان کی گمبھیرتا نہیں سہہ سکتی ـــ اتنے دنوں بعد اس وقت اسے دفعتہً ایک بات کا پتہ چلا تھا۔ وہ اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت تھی۔ وہ اس آدمی سے خوفزدہ ہے۔ اس سے بھاگنا چاہتی ہے ـــ کانونٹ سکولوں کے پڑھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں میں وہ Sex Consciousness نہیں ہوتی جو عموماً سب لڑکوں اور لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ لڑکپن سے اپنے بھائیوں کے دوستوں کے ساتھ

کھیلتی کودتی آئی تھی۔ بڑی ہو کر اسے کرن، دِلّی اور حفیظ احمد کے ایسے دوست ملے تھے۔ سوسائٹی میں وہ بڑے اطمینان سے سب سے ملتی جلتی تھی۔ غفران منزل کی روایات نے اسے ہمیشہ بتایا تھا۔ یوں کرنا چاہئے یوں نہ کرنا چاہئے۔ لیکن جب وہ اس کے سامنے آتا تو غفران منزل اور کروا ہاراج کی روایات کا سارا اثر کنور عرفان علی خاں کی تربیت کی پیدا کی ہوئی "خود اعتمادی" اور "بھروسہ" اور "یقین" ایکدم جانے کہاں کو غائب ہو جاتا۔ اس کے من میں دبکا ہوا شر برا چکا چکے سے کہتا رخشندہ بیگم۔ ایسا ہی ہوگا۔ تم تو زندگی سے کبھی بھی فارغ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اس سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی۔ وہ اسے کلب میں ملتا۔ وہ موقعہ ملتے ہی دوسرے گروپ میں جا شامل ہوتی۔ ٹینس یا بیڈمنٹن میں بھی وہ شریک ہوتا تو وہ فوراً کسی نہ کسی طرح کھیل سے ہار کر علیحدہ ہو جاتی۔ وہ اس کی مزاج پرسی کے لئے آتا۔ وہ بڑے زور شور سے حیدرآبادی شاعروں کے اور اسی طرح کے اوٹ پٹانگ لطیفے سنانا شروع کر دیتی۔ اتوار کے روز وہ غفران منزل کی پارٹیوں میں شامل ہوتا۔ وہ اندر جا کر کنور رانی کے کسی کام میں بڑی سعادت مندی سے مشغول ہو جاتی۔ اگر پکچرز میں اس کے قریب بیٹھا ہوتا۔ وہ فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے معذرت چاہنے کے بعد کسی دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے پاس چلی جاتی۔ کرن نے بڑی فکرمندی کے ساتھ سوچا تھا۔ روشی کو بھگوان جانے کیا ہو گیا ہے۔ بالکل جنگلی بلّی ہوتی جا رہی ہے۔ پرنسپل رتن جھنکر کے اصرار پر وہ پچھلے سال سے میرس کالج میں جسے اب —— یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ہفتے میں تین چار مرتبہ موسیقی کی کلاسیں لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی کبھی کاہلی کر جاتی تھی لیکن اب وہ ملاناغہ

ایک مکمل پروفیسر کی طرح اپنے فرض کے شدید احساس کے ساتھ کالج آنے لگی تھی۔
اس طرح وہ کچھ عرصہ اس ہجوم سے الگ رہ سکتی تھی جس میں وہ لازمی طور پر شامل ہوتا تھا
اس نے کلاس روم کے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ آبنوی کی بیل دیوار سے چمٹ کر
اوپر تک پھیل گئی اور اس پر گرمی میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ کرنیں بکھر رہی
تھیں۔ آبنوی، نازک، خوبصورت، تھکی ہوئی بے خواب آنکھوں کو ٹھنڈک
پہنچانے والی، کسی چیز کا سہارا ڈھونڈنے والی۔ لیکن جس جگہ سے چمٹ جاتی
ہے، مرجھائے بغیر اس سے نہیں چھٹ سکتی۔

اس نے آخری گھنٹہ ختم کیا ہی تھا کہ ایک لڑکی نے آکر اس سے کہا: "روشنی
دیدی۔ آپ کو لینے کے لئے کوئی آیا ہے۔" شاید لی چو یا کرن ہو گا۔ اس نے سوچا
طویل گیلریاں طے کر کے، جن میں پرانے میوزیم کے مجسمے دو رویہ استادہ تھے اور
اپنی پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے اس لڑکی کے رنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھ رہے
تھے۔ وہ باہر آئی۔

سڑک کی دوسری طرف ادھ جم خانہ کے سامنے ایک برگد کے نیچے کار کھڑی
کر کے وہ میرس کالج کی کہرے میں چھپی ہوئی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا یہ
لڑکی ہر جگہ، ہر مجمع میں، ہر موقعے پر کتنی ہر دلعزیز، پرکشش اور ممتاز نظر آتی ہے۔ وہ
خدائے رقص کے پرانے معبدوں کی دیو داسی کی طرح سفید ساری میں جیسے موسیقی
کی لہروں پر بہتی اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور گھاس کے قطعے پر سے گذرنے والے
طالب علموں کی ٹولیاں اسے "نومشکار" اور "نمستے" کہتی جا رہی تھیں۔
"ارے ہلو ڈوک۔ تم کیسے آ گئے؟" اس نے دھندلکے میں سے نکل کر کار کے

قریب پہنچتے ہوئے اسی شگفتگی اور اخلاق سے پوچھا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔
"بھئی میں غفران منزل میں تم سب کا انتظار کرتے کرتے اکتا کر آ رہا ہوں پھر مجھے خیال آیا میں تمہیں یہیں سے لیتا چلوں۔ پی جو تو اب تک کلب پہنچ گیا ہوگا۔ آٹھ بجے سے ٹورنامنٹ کے فائنلز شروع ہیں۔ نہیں معلوم ہے کرسٹابل نے واک اوور دے دیا ہے"۔ اس نے بھی اس طرح کہا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے برابر آ بیٹھی۔

وہ دفعتہً پھر خاموش ہو گیا چپ چاپ وہ دونوں مال کے جگمگاتے ہجوم میں سے گذرتے چھاؤنی کے خاموش راستے پر پہنچ گئے۔ محمد باغ کلب کی برساتی میں داخل ہوتے ہی کار سے اتر کر اور اس کے لئے دروازہ کھول دینے کے بعد وہ اس سے معذرت چاہ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ وہ برآمدے ہی میں رہ گئی۔
"آج کل گیلنٹری تو دنیا میں ناپید ہو گئی ہے"۔ رگنی نے اس کے قریب آ کر ہنستے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ہال کی طرف چلی گئیں۔

تو کیا اسے بھی اس کا احساس تھا کہ وہ بھی اس سے بھاگتا تھا۔ او خدا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ نہایت تندہی سے 'ٹیک اپ' اور 'گرینڈ' اور 'مارولس' چلاتی رہی اور بہت دیر تک ہال کے کنارے بیٹھی کھیل دیکھتی رہی۔

اور وہ جو کہا کرتا تھا کہ عشق کرنا بھی ذرا دلچسپ قسم کے ان ڈور گیمز میں سے ہے۔ جب بارش کے موسم میں ٹینس نہ کھیلا جا سکے یا جاڑے کی وجہ سے سوئمنگ پول میں کودنے کی ہمت نہ ہو یا اخبار پڑھتے پڑھتے جی اکتا جائے تو دفع الوقتی کے لحاظ سے خوب تفریح رہتی ہے وہ ایک دم بہت شدت سے گھبرا گیا۔ اور

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔

رات گئے، کھیل کے اختتام پر، جب ہال کی تیز آرک لائیٹس بجھ گئیں اور سب لوگ باہر نکلے تو پی چو نے مجمع میں سے کودتے پھاندتے اس کے قریب آکر کہا "یار ڈوک بھولنا مت، کل زینت آپا اپنی چوبیسویں سالگرہ کی دعوت کر رہی ہیں" بڑا زبردست قہقہہ پڑا۔ مجمع رفتہ رفتہ منتشر ہونے لگا۔

برساتی میں سے نکلتے ہوئے کرن نے کہا "روشی کل زینت آپا کے ہاں بڑا بھاری 'چاء پانی' ہے۔ چلتے چلتے ڈوک کو خصوصیت سے مدعو کر گئی ہیں"

"ارے ہائے" گنی بے اختیار چلائی۔

"کیوں؟" پی چو نے کان کھڑے کئے۔

"اب آئی دکھیا مارے کی شامت" ڈائمنڈ نے کہا۔

"زینت آپا نے نوڑی سر پہ قیامت زورِ قیامت کیا کہئے" — رخشندہ شہلا رحمٰن کی صحبت میں رہ کر بڑی طبع موزوں کی مالک ہوتی جا رہی تھی۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے غل غپاڑے میں دو گھنٹے گذار کر، میرس کالج کے خاموش کلاس روم میں اس پر فلسفے کی جو موڈ سوار ہوئی تھی۔ وہ کب کی ہوا ہو چکی تھی۔

"کیوں تم سب اتنی ہمدردی دکھا رہی ہو۔ کیا زینت آپا کو حق نہیں پہنچتا کہ اسے چاء ہی پر بلائیں کم از کم" پی چو نے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ کلب کی سڑک پہ چلتے ہوئے کہا۔

"اس کم از کم کی تعریف نہیں کی جا سکتی" ڈائمنڈ بولی۔

"تم سب کی سب بس جلی جاتی ہو ہماری زینت آپا سے" کرن نے کہا۔

"اور بھی قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ہم خاکساروں کو نہیں بلایا گیا" رخشندہ نے کہا۔

"منہ دھو رکھو۔ شرافت کے مجمعوں میں تم سب کو کون بلائے گا ہلڑ مچانے کیلئے، وہاں ـــ بڑے بڑے سنجیدہ قسم کے لوگ ہوں گے۔ تم سب جہاں پہنچتی ہو۔ اپنی الٹی سیدھی بحثوں کے مارے سب کا ناک میں دم کر دیتی ہو" پی چو بولا۔

"جی ہاں۔ بڑا شرافت کا مجمع ہو گا۔ ایک زینت آپا کے دوست وہ آپکے برجیندر کمار روہت ہیں۔ کیا زوردار شاعری کرتے ہیں کہ پچھلے ہفتے زینت آپا کے اس زبردست سیٹرڈے کلب کے مشاعرے میں فرمانے لگے ـــ

ہماری خودی کا جلوہ جواں تھا بزمِ جہاں سے پہلے
مگر یہ نازک مزاج بجلی ٹھہر گئی آشیاں سے پہلے

میں نے بہت دیر تک غور کرنے کے بعد ان سے اس کا مطلب پوچھا تو ارشاد کیا کہ یہ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ اسٹیفن اسپنڈر اور لوئی مک نیس کے اسکول کی شاعری ہے ـــ رخشندہ نے جل کر کہا۔" اور ایک وہ ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ ـــ"

"ارے ہائے زینت آپا" ڈائمنڈ نے مستقبل کی ممکنات کا خیال کر کے ایک سرد آہ بھری۔ دوسرے لحظے زینت ریاض اپنے دستوں کو "چیر ٹو" کرتی شعلے کی لپک کی طرح برساتی میں سے گذر گئیں اور اپنے پیچھے پیرس کی شام کی لپٹیں بکھیرتی گئیں۔

زینت ریاض اس قدر بے تماشا میک اپ کرتی تھیں کہ کسی طرح چونتیس سال چار ماہ کی نظر نہ آئیں مگر کیا کیا جاتا کہ کمبخت لونڈے جانتے تھے کہ جب وہ اسلامیہ سکول کی آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے اور گومتی گراؤنڈز میں آ کر فٹ بال کھیلا کرتے تھے اس وقت آپ یونیورسٹی میں ایم۔ اے فرما رہی تھیں۔ اور اب چلی تھیں کم عمر لڑکیاں

سے "کمپیٹی شن" کرنے۔ ارے بھائی کوئی ایک آدھ پینتالیس ایک برس کا آدمی پکڑ کر شادی کر لو۔ وہ ٹھیک رہے گا۔ ہماری طرف سے تو امید کم ہی رکھو لیکن زینت ریاض سوسائٹی میں بہت ہردلعزیز اور ہر چیز میں پیش پیش تھیں۔ آج کونسل چیمبر میں نظر آ رہی ہیں۔ کل گورنمنٹ ہاؤس میں رونق افروز ہیں۔ بہت سے بھائی بنا رکھے تھے۔ کوئی موٹر چلانا سکھاتا تھا۔ کوئی بال روم ڈانس کا استاد تھا۔

"یہ ساری اولڈ میڈز والی سائیکولوجی ہے۔" انہیں سڑک پر سے گذرتا دیکھ کے کرن نے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا۔ وہ اوما چو کار لانے کے لئے آگے چلے گئے۔

"جبھی تو کہتی ہوں بچیو کہ تم سب جلدی سے شادی کر لو۔ ورنہ یہی سب گڑبڑ سٹر ٹر رہے گی آخر میں۔" گنی نے بھی بہت فلسفیانہ طریقے سے کہا۔

"اب مثلاً لفٹین جہانگیر قدر جو تھا غریب۔" ڈائمنڈ نے تجویز کیا۔

"ارے وہ نوریز روفورس میں ہیں۔" اوما نے اطمینان دلایا۔

"مگر ایک بات ہے۔" رخشندہ نے کہا۔ "جو بھی کہو زینت آپا کے ارادے اس قدر بلند ہیں کہ کوئی ڈھنگ کا لڑکا پکڑا ہی جائے گا۔ دیکھ لینا۔ خدا کی قسم یہی ہو گا۔"

پی چو کار ریکر آ گیا اور وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ویمنز اکیڈمی کی پرنسپل مس زینت ریاض (ایم اے ایل ٹی ایل ایل بی) کے ڈرائنگ روم میں بے حد تاریخی نشستیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی کے چیدہ ولایت پلٹ پروفیسر جنہیں شام کے وقت دنیا میں کوئی اور کام نہ ہوتا تھا۔ یا جن کی ولایت پلٹ بیویاں انہیں طلاق دے چکی تھیں اور بہت سے لوگ جنہیں کوئی اور ٹھکانے

کا مشغلہ نہ سوجھتا تھا۔ ہفتے کی شام کو مس ریاض کے ڈرائینگ روم میں جمع ہو جاتے تھے۔ ان نشستوں کا نام تکلفاً ببٹرڈے کلب رکھ دیا گیا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ ادبی اور انٹلکچوئل قسم کی گفتگو جب آدھ گھنٹے سے زیادہ گھسٹنی بڑی دشوار ہو جاتی تو پھر نارمل قسم کی باتیں شروع ہوتیں۔ مس ریاض اور ان کی سہیلیاں گراموفون، وائلن یا پیانو سے شغل فرماتیں۔ قہوے اور برج کا دور چلتا۔ اکثر یہ نشستیں کسی اور ممبر کے گھر پہ یا کافی ہاؤس میں منعقد کی جاتیں۔ کرن اور دل بھی کبھی کبھی تفریحاً پہنچ جاتے۔ پی جو بھی ایک مرتبہ پکڑا گیا تھا۔ لیکن آدھ گھنٹے بعد ہی اپنی جان بچا کر بھاگ آیا۔ مسعود، ادر برجیندر کمار روہت، ڈاکٹر سکسینہ اور یونیورسٹی کے انگلش اور فلاسفی ڈپارٹمنٹ کے چند پروفیسر کلب کے خاص ممبر تھے۔ ایک بار کرن رخشندہ کو گھسیٹ کر لے گیا تھا کہ چلو ان لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنے میں بڑا مزا آئے گا۔ "جہنم میں جائے تمہارا النفسیاتی مطالعہ۔ یہ سب ادھیڑ ادھیڑ عمر والے۔ شادی شدہ لوگ جو بیٹھے ایک دوسرے سے فلرٹ کر رہے تھے۔ اسی کا نام 'انٹلکچوئیل' اور 'ادبی نشست' ہے۔" رخشندہ نے جل کر کہا تھا۔

اور اب زینت آپا نے سلیم کو مدعو کیا تھا۔ زینت آپا کے دو تین بھائی صاحب تھے۔ کچھ محض بھائی فلاں اور بھائی فلاں تھے۔ چند ایک کو بہت پیار اور اپنایت سے بھیا پکارتی تھیں اور جن لوگوں سے مستقبل قریب یا بعید میں کچھ خوش آیند ممکنات کا تصور وابستہ تھا۔ وہ محض ڈاکٹر فلاں یا مسٹر فلاں یا بے حد بے تکلفی اور محبت سے محض نام لے کر مخاطب کئے جاتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے محمد باغ کلب سے واپس جا کر سلیم کو فون کیا کہ ہلو میجر ۔ بھئی آپ کو کل شام

کو ضرور آنا پڑے گا۔ ورنہ میں بے حد خفا ہو جاؤں گی تو اس نے فی الفور یہ عرض کی کہ بدقسمتی سے شہر میں ایکا ایک نمونیہ کی وبا پھیل گئی ہے اور اس کی وجہ سے اسے رات گئے تک فرصت نہیں ملتی۔ ذہینت آپا نے کہا۔ ارے پھر کیا ہے۔ میں آپ کو چھ بجے تک ہسپتال ہی میں کار بھیج دوں گی اور یہاں پر اس عذر کا سوال بھی پیدا نہ ہو سکا کہ میری موٹر خراب ہے۔

وہ چاء کے دوران میں حسبِ معمول زیادہ تر خاموش رہا۔ حمیدہ تنویر اس کے قریب بیٹھی تھی۔ حمیدہ تنویر افسانے لکھتی تھیں اور ناک میں بولتی تھیں۔ جانے کیوں اور کہاں سے افسانے لکھنے کا خبط سوار ہو گیا تھا۔ ان کی چند کہانیاں رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں۔ ایک مشہور افسانہ نگار سے جس کے حسن اور شولری کے بہت شہرے تھے۔ غائبانہ عشق فرما رہی تھیں اور اپنے ہر افسانے کا ہیرو اسی کو بناتی تھیں۔ کمرے میں داخل ہونے ہی جانے کس نے ان کو بتا دیا کہ یہ کالی، فتنہ انگیز آنکھوں والا تازہ وارد مہمان انگریزی کا بہت مشہور ادیب ہے۔ لہذا چاء کے دوران میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "ہم نئے ہندوستان کے نوجوان ادیب —"

وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ یہاں پر تو ٹیلنٹ ہی ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔ اس نے سوچا کل ان صاحبزادی نے جو انگریزی شاعری پر کرم فرماتی ہیں۔ تمدّنی پس منظر کی نظری ہم آہنگی پر تقریر کی۔ نئے ہندوستان کی ایک نوجوان ادیب یہاں پیدا ہو گئیں۔ یہ جو سامنے سے بال بکھرائے سفید ساری پہنے ایک لڑکی چلی آرہی ہے یہ اب یقیناً ٹیگور پر لیکچر پلائے گی۔

بڑا ٹریجک منظر وہ ہوتا ہے جب یہ خوبصورت عورتیں اپنی ہلکی پھلکی بے معنی سوسائٹی کی گفتگو چھوڑ کر "انٹلکچوئیل" باتیں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب وہ یکاسو جیمز جوائس یا نئے ہندی یا اردو ادب پر تنقید کرنا چاہتی ہیں۔ جب وہ بے حد شیریں آوازیں پوچھتی ہیں "۔ آپ نے یشپال کی نئی کہانی پڑھی ؟"

چاروں طرف بڑی زوردار انٹلکچوئیل گفتگو جاری تھی۔ ملک کے اقتصادی مسائل اور عالمگیر سیاست اور نہرو خاندان کی پولٹیکس کا تذکرہ تھا۔ زینت آپا نے سینڈ وچز کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے اسے مطلع کیا کہ مسز وجے لکشمی پنڈت میری بہت گہری دوست ہیں۔ آج اس پارٹی میں نہیں آسکیں۔ کیونکہ انہیں صبح صبح ہی کسی کام سے نیویارک جانا پڑ گیا۔ اگلی مرتبہ ان سے ضرور آپ کو ملواؤں گی سلیم نے ظاہر کیا گویا واقعہ یہ ہے کہ یہ معلوم کرکے اس پر سخت رعب پڑا ہے۔

"چندرلیکھا پنڈت سے تو آپ رخشندہ کے ہاں ضرور ملے ہوں گے" انہوں نے دریافت کیا۔

افسوس کہ اب تک وہ چندرلیکھا پنڈت سے نہ ملا تھا" وہ بھی میری بہت گہری دوست ہے" زینت آپا نے بتایا۔

دوسری طرف ڈاکٹر وجے بہادر سکسینہ شہلا رحمٰن سے فرما رہے تھے۔ دراصل انگلز نذر لیپ کا منتہائے نظر صرف یہ تھا کہ اٹلی کی نیو کلاسسزم کے بنیادی اصول ــــ (کس قدر کلاسیکل گفتگو تھی) ــــ جب چائے ختم ہوئی تو وہ حمیدہ تنویر سے اجازت لے کر دوسرے گروپ میں جا کر شامل ہو گیا۔

" راجہ ہوں میں قوم کا اور اندر میرا نام" کرن نے اس کی طرف آتے ہوئے

چپکے سے کہا۔ اسے ہنسی آگئی۔ وہ دونوں باہر برآمدے میں آ گئے۔

"ارے او میاں شہزادے گلفام ــ بات تو سنو۔" وِمل نے اس کے پاس آکر کہا۔ "بھئی جب سے تم یہاں آئے ہو تمہارے چاروں طرف بس لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آرہی ہیں۔"

"جب تک اسمبلی میں اس مسئلے پر سوال نہ اٹھایا جائے صورتِ حال پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔" چودھری شمیم نے فرمایا اور خود ہی ہنسنے لگے۔ گویا بڑی لطیفے کی بات کہی ہے۔

جس وقت وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دو بزرگوں کو باغ کی سڑک پر ٹہلتے ہوئے کلچر کے مسائل پر روشنی ڈالتے سنا۔ "کلچر بھائی جان، بیک گراؤنڈ اینڈ موسفیئر ــ یہ چیزیں جواب صرف بٹلر پیلیس یا بیرپور ہاؤس یا عفران منزل میں نظر آتی ہیں ــ دراصل ــ"

عفران منزل، عفران منزل، عفران منزل۔ اسے کہیں تھوڑی دیر کے لئے بھی عفران منزل سے فرار میسر نہیں تھا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ زینت آپا، حمیدہ تنویر، اور شہلا رحمٰن ٹہلتی ہوئی اسے پھاٹک تک پہنچانے آئیں۔ شب بخیر، خدا حافظ اور چیریو کے بعد وہ بے حد اکتا کر، بے حد تھک کر وہاں سے روانہ ہوا۔

جب وہ گھر پہنچا۔ اس کے سر میں شدت سے درد ہو رہا تھا اور اس کی میز پر اگلے اتوار کے لئے عفران منزل اور لالہ رُخ والوں کی طرف سے ایک اور پارٹی کا دعوت نامہ رکھا ہوا تھا۔

تم ٹھیک کہتے تھے او شبیر بھائی۔ یہاں پر سب جسم ہی جسم ہیں۔ صندلی، گرم

خوبصورت، روح کہیں نہیں ملتی۔ کہیں نہیں ملتی۔

نکلتے جاڑوں کا خشک اور غیر دلچسپ زمانہ آ پہنچا تھا۔ وہ زمانہ جب ہوائیں زرد پتے اڑتے ہیں اور دوپہر کو نیند آنے لگتی ہے۔ کرن کچھ عرصے کے لئے اپنے لنچاک کے سلسلے میں پھر ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ دل بھی بہت شدید قسم کا بور ہوتا جارہا تھا اور ریڈیو پر انگریزی ڈرامے پروڈیوس کرنے کے بجائے اب سیاست حاضرہ پر بڑے بڑے سیاست دانوں کی تقریریں کروانے پر جُٹ گیا تھا۔ دُنیا میں بلکہ خت بڑا زبردست قومی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بڑی مجاہدانہ شان سے آنے والے بڑے الیکشن کے لئے گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی اپنی جماعتوں کا پرچار کر رہی تھیں۔ امین آباد پارک اعلیٰ پیمانے کا سیاسی اکھاڑہ بن گیا تھا۔ شام کے وقت مخالف سیاسی پارٹیوں کے دفتروں سے لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ایسے زوردار قصیدے ایک دوسرے کی شان میں عرض کئے جاتے تھے کہ ایک لحظے کے لئے عقل حیران رہ جاتی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہوتا جاتا جا رہا ہے۔ وہ تاریخی امیرالدولہ پارک اور امین آباد جہاں ان گئے گذرے وقتوں میں بھی گرمیوں کی شاموں کو ہجوم کی وجہ سے کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور بیلے چنبیلی کے گجرے والے اور بیلے کی انگلیوں، ایسی ککڑیاں اور خس میں لگا ہوا آفالودہ بیچنے والے اپنی مخصوص صداؤں سے شام اودھ کی یاد تازہ کر دیا کرتے تھے۔ ان سب پرانی، مانوس آوازوں اور محبوب فضاؤں پر لاؤڈ اسپیکرز کی آوازیں غالب آگئیں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال اور قیصر باغ کی بارہ دری میں مشاعروں اور کلچرل

پروگراموں کی جگہ سیاسی جلسوں کی تعداد روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں میں اسٹرائیکوں اور مظاہروں کا اوسط روزانہ کی کلاسوں کے مقابلے میں زیادہ بیٹھنے لگا۔ انقلاب زندہ باد۔۔ ہے سجنو اور دیویو۔۔ ہے پوجئے بھائیو اور بہنو۔۔ ہے کرانتی کاریو۔۔ کدم کدم بڑھائے جاؤ۔۔ کدم کدم۔۔ ہر کونے کھدرے سے بھانت بھانت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

کنور صاحب باہر کی دنیا کی اس دیوانگی، اس جوش و خروش ان ہماقتوں سے بے نیاز اپنے کمرے کے جھولنے والے صوفے پر بیٹھے حافظ اور بو علی سینا کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ کرواہاراج کے ہرے بھرے علاقے بالکل پُرامن تھے۔ ان کی رعایا مطمئن تھی۔ اس سال فصلیں خوب پیدا ہوئی تھیں۔ کمایوں ڈویژن کے نینی تال کے علاقے میں کنور صاحب کے جتنے جنگلات تھے۔ ان کی لکڑی جنگ کے زمانے میں گورنمنٹ کو ٹھیکے پر دی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے الغاروں روپے کا منافع ہوا تھا۔ جو بدامنی اور شرانگیزی ملک کے گوشے گوشے میں بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا کرواہاراج میں دور دور تک گذر نہ تھا۔ کنور صاحب پرانی تہذیب کے اداروں اور روائتوں کے تحفظ اور پابندی کی حد تک قدامت پرست ضرور تھے۔ لیکن رجعت پسند کسی حالت میں نہ تھے گو انہیں اپنے خاندان کے "قومی ہیرو نمبر ون" خورشید سے کوئی ہمدردی نہ تھی - وہ اپنے بچوں اور ان کے ساتھیوں کے شائع کئے ہوئے رسالے کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن مفسدوں، فتنہ پردازوں اور فرقہ پرستوں کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتے تھے۔ اپنے اصولوں اور عقیدوں کی پابندی ان کے نزدیک ان کا عزیز ترین اور مقدس فریضہ تھا۔ اس لئے انہیں

اس کی پروا نہ تھی کہ ان کے خلاف پروپگنڈے اور عوام کی بدلتی ہوئی ذہنیت کی وجہ سے ان کی ہردلعزیزی میں فرق آچلا ہے۔ میدان سیاست میں، کونسل چیمبر کی فلور پر، تعلقے داروں کی ایسوسی ایشن کے جلسوں کے موقع پر، ہر جگہ، ہر وقت بڑے شدومد سے ان کی مخالفت کی جاتی۔ خصوصاً امبرپور راج والے جن کی خاندانی معاملات کی وجہ سے ہمیشہ سے ان کی کھٹ پٹ چلی آتی تھی۔ میدان سیاست میں آکر مخالف جماعت کے لیڈر کی حیثیت سے کنور صاحب کے سب سے بڑے حریف ثابت ہوئے تھے۔

پی چو اپنی رینج کے اضلاع سے واپس آگیا تھا۔ رخشندہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی نیوابرا کے پروف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پی چو سے پوچھا "پی چو تم تو اس وقت صوبے کا بڑا حصہ دیکھ کر آرہے ہو۔ تم نے کچھ محسوس کیا۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ کس طرف جا رہے ہیں"۔ "روشی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کے سب کیوں بھیڑ چال پر آنکھیں بند کئے اندھا دھند ایک سمت کو بھاگے جا رہے ہیں"۔ وہ تھک کر دیوان پر گر گیا۔ "ہٹاؤ گولی مارو۔ آج شام کا پروگرام کیا ہے؟ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچنے والا ہوں کہ فراری بہترین اور دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ دمل کو فون کردو۔ شام کو کلب آئے۔ جانے کرن لندن سے کب تک واپس آئے گا"۔ اس نے کہا۔

رخشندہ پروف سمیٹ کر گیلری کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے سید افتخار اس سے مل کر گئے تھے۔ وہ آسانی سے اپنی مقامی سیاست کے سلسلے میں کرن یا دمل سے مل سکتے تھے۔ لیکن رخشندہ لڑکی تھی اور حالانکہ وہ ان کا بالکل نوٹس نہیں لیتی تھی لیکن بہرحال ایسی خوبصورت اور دلچسپ لڑکی سے چند منٹ کے لئے ہی باتیں کر لینا اس نازک اور پرآشوب دور میں اپنا موریل قائم رکھنے کے لئے بہت مفید تھا۔

اس نے بہت اکتا کر وِل کو فون کرنے کے لئے رسیور اٹھایا۔ اس وقت اس کا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح اس ماحول اس دنیا سے نکل بھاگے غمِ دل ہی کیا تھوڑا تھا۔ کہ اوپر سے غمِ روزگار بھی سر پر آن پڑا۔ اگلے روز ۲۱ مارچ تھی اور غفران منزل میں جشنِ نوروز منایا جانے والا تھا غفران منزل میں بڑے کنور صاحب مرحوم کے زمانے سے جشنِ نوروز ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اندر اور باہر دعوتیں ہوتی تھیں۔ رنگ کھیلا جاتا تھا۔ ہوا میں گلاب جگمگاتے تھے۔ غفران منزل کی ساری مہریاں سال بھر اس دن کی راہ دیکھتی تھیں کہ کب وہ پی چو اور ریو کو بھیا پہ رنگ پھینک سکیں گی۔ وِل سے بات کر کے وہ تھکے تھکے قدم رکھتی برآمدے کی سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ پی چو اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ باغ میں "امتحان کی ہوائیں" چل رہی تھیں۔ بیحد عجیب دلچسپ جان سے عاجز کر دینے والا زمانہ تھا (وہ زمانہ جب مکھیاں بھنبھنانا شروع کر دیتی ہیں۔ سالانہ امتحانات سر پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ دن بھر سائیں سائیں کرنے والی اُسی پھیکی اور خشک ہوائیں چلتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کتابیں پٹخ کر دنیا سے کہیں بھاگ جائیے۔ زرد پتے اور گرد کے بگولے فضا میں منڈلاتے ہیں۔ پڑھنے میں جی نہیں لگتا لیکن مجبوراً سال بھر کی پڑھائی اسی زمانے میں کرنی پڑتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کافی ہاؤس یا پکچر زچلا جائے۔ لیکن یاد آتا ہے کہ ابھی چار پرچوں کی تیاری اور کرنی ہے اور صبح ہوتے ہی

EXAMINATION WINDS

پھر سے چلنا شروع ہو جائیں گی۔ دن بھر لائبریری جا کر جلدی جلدی آخری اور ضروری کتابیں دیکھ کر نوٹس مکمل کرنے ہوں گے۔ سہ پہر کو برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے پھر نیند آئے گی۔ رات کو کافی پینے کے بعد پڑھنے کے بجائے گپ

کرنے کی شدید خواہش پھر پیدا ہوگی۔ یا اللہ تو اس امتحانوں کے چکر سے کب نجات دے گا۔ اسے ہائے سلیم۔ لعنت ہو) وہ دل پر جبر کر کے جذبۂ شہادت کے ساتھ کتابوں کا انبار اپنے کمرے سے اٹھا لائی اور پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور سامنے لان پر گرتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھنے لگی جو ہوا سے اڑ اڑ کر چاروں طرف بکھر رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ اگر اس وقت ایسے میں سلیم آن پہنچے تو کیا ہو۔ وہ پھر ہمیشہ کی طرح اسے بے حد اخلاق سے پی جے کے سٹنگ روم میں لے جائے گی اسے کرن اور فیروز کے تازہ ترین لطیفے سنائے گی، اس سے پچھلی شام کی پارٹی کی کامیابی کا ذکر کرے گی — یہ سلسلہ یونہی مہینوں سے، مدتوں سے چل رہا ہے۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ اس زیادتی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ اسے بچپن میں پڑھی ہوئی "ایلس اِن ونڈرلینڈ" یاد آئی جو موسم گرما کی ایک غیر دلچسپ دوپہر کو ندی کے کنارے اونگھتے اونگھتے ایک دم ونڈرلینڈ میں پہنچ گئی تھی۔ اگر مجھے پرستان لے جانے والا ایک سفید خرگوش مل جاتا تو میں اس سے پوچھتی میاں خرگوش تم کاہے کے لئے ایسے ونڈرلینڈ بناتے ہو۔ جن کی سیر صرف ایک سہ پہر کی نیند میں ختم ہو جاتی ہے۔

اور تب ایسا ہوا کہ لان کے کنارے یوکلپٹس کے جھنڈ میں بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑائے اور انہیں روندتا ہوا سلیم واقعی بالکل اس کے قریب نچلی سیڑھی پر آن کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم یا امیر المومنین"۔ رخشندہ نے بڑی شگفتگی سے کہا

"بڑے زوروں میں پڑھائی ہو رہی ہے؟ دوپہر کو جب نیند آ رہی ہو تو زبردستی

کتابیں دماغ میں ٹھونسنے کی بجائے طالب علموں کو ہمیشہ دو گھنٹے سو لینا چاہیئے"۔ وہ بولا

"ابے یار کیا بلے کی طرح کھڑے حفظانِ صحت پر تقریر کر رہے ہو۔ کب آئے، کیوں آئے، کیسے آئے۔ سب فوراً تفصیل سے مطلع فرمادو"۔ سلیم کی آواز سنتے ہی پی چو اپنے کمرے کے دریچے میں سے جھانک کر چلایا۔ سلیم فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ارے بھائی جالینوس ـــ چنڈو خانے کی تازہ ترین اطلاع ہے کہ شہلا رحمٰن نے تمہاری یاد میں ایک سانیٹ لکھا ہے۔ تمہاری نیوسنس ویلیو بہت بڑھتی جا رہی ہے بھائی ـــ پی چو نے حسب معمول بے حد بشاشت کے ساتھ اس سے کہا۔ وہ چڑ گیا۔ کل شام کلب میں اس سے کسی نے کہا تھا کہ بھئی سلیم خاں سنا ہے تم مس رحمٰن میں بہت دلچسپی لیتے ہو۔ آخر یہ لڑکی کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ رخشندہ کی پڑھائی میں مخل ہونے کے خیال سے پی چو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

لیکن رخشندہ کا جی پڑھائی میں کہاں لگ رہا تھا۔ وہ کب سے چاہ رہی تھی کہ کتابیں وہیں چھوڑ کر پی چو کے کمرے میں جا بیٹھے اور شام کی چائے تک گپ شپ کرے۔ اور شہلا رحمٰن کا نام سن کر اس نے کان کھڑے کئے۔ سلیم کی ٹانگ کھینچی جا رہی ہے اور یہ سوچ کر اسے ہنسی آگئی کہ شہلا رحمٰن کا سانیٹ کیا مزیدار تاریخی چیز ہو گی۔ وہ سیڑھیوں پر سے چلائی۔

"اور سلیم وہ جو حمیدہ تنویر ہیں نا۔ آپا رابعہ کہتی ہیں کہ اپنے اگلے افسانے کا ہیرو وہ قطعی تم کو بنائیں گی"۔

"بہت خوب۔ رخشندہ بیگم اگر آپ مجھے بنانے کی فکر میں ہیں تو میں نہایت ادب

سے لفٹین جہانگیر قدر کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں۔ آج میرے نام ان کا نامہ موصول ہوا ہے کہ جشن نوروز میں شرکت کرنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ مجھے معمولی زکام کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے" سلیم نے دریچے میں سے جھانک کر کہا۔ ارے کہاں سے اسے معلوم ہو گیا کہ کنور رانی نے جہانگیر قدر کو بھی مدعو کیا ہے جو پچھلے ہفتے سے الہ آباد آیا ہوا تھا خوش قسمتی سے اسی وقت رخشندہ کے ساتھ امتحان کی تیاری کرنے کے لئے گنی آن پہنچی۔ اس نے رخشندہ کی طرف داری کی "جناب آپ سب جلتے ہیں بچارے لفٹین سے" اس نے کہا۔

"ہنہہ سسی"۔ پی چو بولا۔

"سسی؟ — اس سے زیادہ خوبصورت آدمی ذرا شہر لکھنؤ میں دکھلا دیجئے آپ" گنی نے جوش سے کہا۔ پی چو کو غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً کھڑے ہو کر جہانگیر قدر کی رفتار و گفتار کی بہترین نقل کر ڈالی۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔

"کیوں بچارے کی روح کو شرمندہ کرتے ہو۔ غریب نہ لینے میں نہ دینے میں سوت نہ کپاس"۔ رخشندہ نے کہا۔

"ہاں بھئی اور کیا۔ لینا دینا یہ وہ" — گنی بولی۔ سب کو ڈاکٹر لینا دینا کر یاد آ گئے تھوڑی دیر میں ریڈیو اسٹیشن سے اپنے اپنے کام ختم کر کے ڈائمنڈ اور ومل بھی آ گئے۔ بڑے زور شور سے بحث شروع ہو گئی۔ لکھنؤ کا خوبصورت ترین آدمی یعنی 'بیوٹی کنگ' کون ہے"۔

"ٹمون الندر دی گریٹ بچارہ سب سے خوبصورت ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں"۔ پی چو فوراً بولا۔

"آپ کے کہنے سے؟ ایک عالم اُسے گلیمر بوائے کہتا ہے۔ آپ جلا کیجئے۔" رخشندہ نے کہا۔

"تم لڑکیوں کو بس گریگری پک جیسی ہی پسند آتے ہیں۔ جانے کیا بائولا معیار ہے۔" پی چو نے بگڑ کر کہا۔

"جی ہاں اور آپ لوگوں کا معیار کیا ہے گھاس کھایا ہوا۔ ایک سے ایک بولائی ہوئی لڑکی کو کہدیں گے بہت حسین ہے۔ اب ذرا غور کیجئے۔ وہ ایک اینگلو انڈین لڑکی نہیں ہے جو پچھلے سال دیوسے کی میوزک کانفرنس میں ناچی تھی۔ پی چو صاحب اسے دیکھ کر وہاں فرمانے لگے کہ بے حد خوبصورت ہے۔" رخشندہ بولی۔

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ خوبصورت ہے بس ذرا کلاک کرتی ہے۔" پی چو نے احتجاج کیا۔

اس اینگلو انڈین لڑکی کے ذکر پر سلیم بالکل خاموش رہا اور بڑے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

"کیوں بھئی 'کلاک کرتا ہے' بھی ہو سکتا ہے؟" گنی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"قطعی۔" دِل نے اسے جواب دیا۔

دفعتاً رخشندہ کو خیال آیا۔ دراصل یہ بات ہے۔ یہ شخص۔ یہ سلیم کلک کرتا ہے اتنے عرصے سے جو وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی کہ اس نے اتنا پریشان کیوں کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ محض یہی ہے (یہ طے کر کے اُسے کچھ اطمینان سا ہو گیا)

چند روز پہلے وہ سب ساٹو کی نئی فلم پنجیر زد دیکھنے گئے تھے۔ اس میں ایک آدمی سارے وقت مونوکل لگائے رہتا تھا۔ پی چو کو یہ سٹائل بہت بھا گیا اور وہ کہنے لگا

کہ ارے قسم خدا کی میں بھی مونوکل لگاکر اتنا ہی ڈیشنگ بالکل ہنری فونڈا کا بھتیجا لگوں گا دوسرے روز ہی وہ اسحٰق کے ہاں سے ایک مونوکل خرید لایا اور بڑے ٹھاٹھ سے اپنے یونیفارم اور پیک کیپ کے ساتھ مونوکل لگالی ——— اس وقت مردانہ وجاہت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے اسے تاؤ آگیا اور جھٹ اپنی مونوکل لگاکر آن بیٹھا۔ ہنستے ہنستے لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سلیم بھی اس روز خلاف عادت خوب ہنس رہا تھا۔

اور اس کو اسی طرح ہنستے اور بے فکری سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے دیکھ کر رخشندہ نے دفعتہً اپنے آپ سے پوچھا۔ یہ شخص یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ ہم سب اس مخصوص لمحے میں اس مخصوص جگہ پر خود کو کیوں موجود پا رہے ہیں۔ زندگی کے معمے کے مختلف ٹکڑے اس وقت اس خاص نمونے سے کس طرح جمع ہو گئے ہیں پھر کچھ ہوگا۔ کوئی ایسی بات ہو جائے گی جس سے یہ ٹکڑے بکھر جائیں گے۔ پھر وقت کی پرواز کے ساتھ کوئی نیا معمہ بن جائے گا۔ کوئی نیا حل تلاش کر لیا جائیگا ہم جہاں ہیں اس جگہ نہ ہوں گے۔ یہ سمے آگے نکل جائے گا۔ زندہ رہنے کی خوشی رہنے کی خواہش، زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے معصوم بے بس انسان ——— آنے والے دن اور آنے والی راتیں ان سب کے لئے کیا لائیں گی۔ ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی۔ ان کے دل کیوں دھڑکیں گے۔ کوئی نہیں جانتا یہ سب کھیل ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے (اوہ میں تو فلسفی ہوگئی ہوں بڑی بھاری۔ اس نے سوچا۔ بھلا سلیم کو کیا معلوم کہ اس وقت وہ کن فلسفیانہ بلندیوں پر پہنچ گئی ہے۔ اسے ہنسی آگئی اور وہ سب تھکے

قہقہوں میں شامل ہوگئی)
لان پر یوکلپٹس کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے۔

•

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد "ملتِ بیضا" کا ایڈیٹر اپنے نظر باغ کے فلیٹ میں بیٹھا خلال کر رہا تھا اور ایک فلمی رسالہ دیکھتا جاتا تھا۔ غفران منزل کے پھاٹک سے نکل کر انڈیا کافی ہاؤس کا ایک چکر لگاتے ہوئے۔ (کیونکہ سارے اخبار نویسوں اور "انٹلکچوئیل" لوگوں کی نشست دوپہر کے وقت عموماً انڈیا کافی ہاؤس میں ہوتی تھی) سید افتخار نظر باغ پہنچے۔ "السلام علیکم" انہوں نے اندر داخل ہو کر کہا۔
"وعلیکم بھائی"۔ اڈیٹر نے بادل ناخواستہ رسالہ بند کر کے ایک طرف پھینک دیا جس میں رنگین اور سادہ سب ملا کر بیگم پارہ کی بیس تصویریں تھیں جو ہندوستان کی "او معنکرل" کہلاتی تھی۔
کہو بھئی کیا حالت ہے"۔ اس نے سید افتخار کو بہت افسردہ دیکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔
"کاہے کی۔" انہوں نے سگریٹ جلاتے ہوئے سوال کیا۔
"بھئی ___ مقامی سیاست کی"۔
"ہُم ___ معلوم ہوتا ہے یہاں کی اس "انٹلکچوئیل" فضا کا اثر تم پر بھی ہو گیا ہے بہت ضلع جگت پر اتر آئے ہو" سید افتخار نے کہا۔
"قصہ تو بتاؤ ___ کوئی اسکوپ؟"
"ارے اسکوپ کیا وہی اس لونڈیا کا چکر ___"

"کیا ہوا ؟" اڈیٹر نے کلجنت بے حد دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔" ارے میاں آگئے تم بھی اس کے پھیر میں ؟ چلو یہ بھی اچھا ہوا — کس ادا سے اس رات کمبخت نے کہا تھا۔ ٹھہریئے بھئی میں خود سید صاحب سے کچھ کہنا چاہتی ہوں —— اوہو ہو ہو۔ اب تازہ ترین پیچیدگیاں کیا ہیں ؟"

"قصہ یہ ہے کہ تم نے کنور صاحب پر جو اڈیٹوریل لکھا ہے۔ اسے شائع نہ کرو۔" سید افتخار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہوں ہم — یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کاپیاں پریس میں جا چکی ہیں۔"

"غلط بات ہے۔ لوسگر یٹ —"

"دیکھو رحمت اللہ خان میری بات مذاق میں نہ اڑاؤ۔ آج رخشندہ بیگم سے میں ملنے گیا تھا۔ اس نے پورے دس منٹ تک مجھ سے بڑے اخلاق سے برآمدے میں کھڑے باتیں کیں جس سے ظاہر ہوا کہ وہ قطعی ہماری پارٹی کے بہت زیادہ خلاف نہیں ہے اور ہماری سیاست کے چند بنیادی اصولوں کو بھی ایک حد تک درست ماننے کے لئے تیار ہے۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہا کہ آئندہ اتوار کو نیو آیر اسکے سالانہ جلسے میں میں اپنے اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کروں وہ واقعات بڑے امید افزا ہیں اور اس حالت میں یہ قطعی ممکن نہیں کہ وہ مضمون شائع کیا جائے جس میں کنور صاحب اور ان کے سیٹ کو خالص ہمارے اسٹائل میں گالیاں دی گئی ہیں۔ اماں جہنم میں جائے تمہارا" ملت بیضا۔ آج اس کمبخت نے ہنس ہنس کر باتیں کیں کہ دل لوٹ گیا قسم خدا کی —"

"دیکھئے سید صاحب —" اڈیٹر اٹھ کھڑا ہوا "میں بہت طرح دیتا ہوں لیکن

اب مجھے غصہ آجائے گا۔ آپ کو کیا حق ہے کہ میرے اخبار کے لئے یہ لفظ استعمال فرمائیں۔ اخبار آپ کا زرخرید نہیں۔ نہ یہ خاکسار آپ کا غلام ہے۔ اڈیٹوریل قطعی پچھے گا۔ ایک ٹی پارٹی اور لونڈیوں کی چند مسکراہٹوں کی خاطر قوم کو بیچنا آپ کو منظور ہے؟"

"اماں ـــ ہیں ـــ واللہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہوش میں رہو میاں" سید افتخار نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ کیونکہ انہیں یاد آگیا کہ رحمت اللہ خان ملیح آباد کا پٹھان تھا

"خوب جانتا ہوں نیواپرا کے ایٹ ہوم میں تمہیں کیوں مدعو کیا گیا ہے کیونکہ کنور صاحب تم سے خوفزدہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تم اور تمہاری پارٹی نے ان کی ریاست اور ان کے حلقہ انتخاب میں کتنا زور باندھ رکھا ہے پچھلے الیکشن میں وہ اس کا نتیجہ بھی دیکھ چکے ہیں۔ مجھ کو تم اتنا بیوقوف مت سمجھو ـــ" اڈیٹر نے میز کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تو ـــ تم کیا کرو گے؟"

"میں ـــ؟ میں اپنی پوزیشن اور اس کے فائدوں سے خوب باخبر ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ مضمون نہ چھپے تو اپنی چیک بک نکالو اور ایک چیک اس خاکسار کے نام کاٹو اسی وقت ـــ خوب چپڑی اور دو دو۔ لونڈیوں سے عشق لڑانے کی فکر بھی ہے اور مجھ پر بھی دھونس ہے۔ اگر ایسا مضمون شائع نہ ہوا تو میرا اخبار کیسے چلے گا اور میں کھاؤں گا کہاں سے۔ سب ہی تو تمہاری طرح ہائی کمانڈ کی آنکھوں کا تارا نہیں ہوتے۔ اس طرح کے مضامین کی آج کل عوام کے لئے کتنی زبردست اپیل ہے جو روز صبح ملتِ بیضا کے انتظار میں امین آباد کے چوراہوں پر کس

اشتیاق سے اکھڑے ہوتے ہیں۔ یہ شاید تم کو بھی معلوم ہوگا۔ اور ــــ"

"اور پھر ــــ؟"

"پھر؟ ــــ میں ابھی کنور صاحب کے پاس بھی جاتا ہوں۔ اگر وہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ مضمون شائع نہ ہو تو ایک چک انہیں بھی کاٹنا پڑے گا ــــ یہ اردو صحافت ہے بھائی جان محض قوم کی لیڈری نہیں ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ ملتِ بیضا کے مقابلے میں دوسرا رسالہ نکالو تو بسم اللہ ــــ اور پھر آؤ میدان میں۔"

جب وہ اپنا سارا پٹھانی جوش ختم کر چکا تو اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر اس نے رسالہ اٹھا لیا جس میں بیگم پارہ کی بیس تصویریں تھیں۔ گویا کاٹو چک دیکھتے کیا ہو۔ سید افتخار نے خاموشی سے اپنا فاونٹین پن جیبوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا۔

پھر گرمیوں کا موسم آیا۔ جب رات کے وقت باغ کے زمین میں سے چھڑکاؤ کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی اور سوندھی لپٹیں اٹھتی ہیں اور چھت کی منڈیروں پر چھپروں اور صراحیوں پر لپٹے ہوئے گجرے پڑے مہکتے ہیں اور گھر سے نکل کر باہر خاموش سڑکوں پر ٹہلنے کو جی چاہتا ہے۔

علی گنج کا سالانہ میلہ ہونے والا تھا۔ سڑکوں پر سے رات بھر ٹپکیا کرنے والے عقیدت مندوں کی ٹولیاں گذرتی رہتیں۔ سڑک کی جلتی ہوئی زمین پر ہر پانچ قدم بعد قلابازیاں کھاتے دہ کوسوں دور سے ہنومان جی کے مندر کی سمت ہر سال اسی طرح چلے آتے تھے اور رات کے سناٹے میں "جے بجرنگ بلی" کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ سارے شہر میں سڑکوں کے کنارے کنارے دو لتے

ہندوؤں نے یاتریوں کے لئے سبیلیں لگا رکھی تھیں۔ انسان کی اندھی طوفانی عقیدت کا یہ بڑا عجیب و غریب مظاہرہ ہوتا تھا۔ انسان بڑا عجیب طرح کا جانور ہے۔ اس کی سمجھ اور اس کی ناسمجھی، اس کی محبت اور اس کی نفرت، اس کے جذبات کی اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ لگانا ماہرین نفسیات کے بس کا کام نہیں۔

گنی بھی بڑی خوش عقیدہ لڑکی تھی۔ دوستوں کے گروہ میں بیٹھ کر توہمات اور مذہبی حماقتوں کا مذاق اڑانے والی یہ "روشن خیال" اور "ترقی پسند" لڑکی ہر سال اپنی ممی کے ساتھ علی گنج جاکر ہنومان جی کے سامنے پرشاد چڑھاتی اور وہاں سے اپنی شفید خوبصورت پیشانی پر تلک لگائے خوش خوش واپس آجاتی۔ بھگوان کے مندر یا درجن میری کی عبادت گاہ میں ایک لمحے کے لئے دل و دماغ کو جو مکمل ناقابل بیان سکون، جو پاکیزگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سامنے عقل پرستوں کی ساری منطقیں بیکار ہیں۔ — مسوری جانے کا پروگرام حسب معمول لڑکیوں کے سالانہ امتحانات ختم ہونے ہی بن چکا تھا لیکن کرشن نرائن کول آئی سی ایس کی کوٹھی کے پھاٹک پر ٹھنڈے شربت کی جو سبیل لگائی گئی تھی۔ میلے کے دوران میں اس کا انتظام محض نوکروں پر چھوڑ کر کول خاندان کسی طرح بھی لکھنؤ سے باہر نہ جاسکتا تھا اور کول خاندان کے بغیر کنور صاحب کا کنبہ کہیں نہ جاتا تھا اور کنور صاحب کے کنبے کے بنا کرشا بل اور حفیظ احمد اور دوستوں کا سارا قبیلہ ہرگز بھی کہیں موو نہ کرسکتا تھا۔ پھر ابھی سلیم اور پی جی کو رخصت نہ ملی تھی اور وہ دونوں اپنے ضلع سے واپس نہ آئے تھے۔

رخشندہ خوش خوش پیکنگ میں مصروف تھی کہ ایک روز فون کی گھنٹی بجی اور ایک اجنبی اور بڑی شیریں آواز نے ٹینس کے گرین روم سے پوچھا کیا ڈاکٹر سلیم

پرتاپ گڈھ سے آگئے ہیں؟" جی نہیں"۔ رخشندہ نے کہا "ممکن ہے۔ وہ آج یا کل ہی آجائیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کا پیغام ان کو بتا دیا جائے گا"۔ "اوہ کوئی بات نہیں شکریہ"۔ "بالکل ٹھیک ہے"۔ رخشندہ نے بڑے اخلاق سے کہا اور بات ختم کر دی

دوسرے روز سلیم اور پی چو جب پرتاپ گڈھ سے آئے۔ اس وقت تک سفر کی تیاریوں کے ہنگامے میں وہ اس فون کو بالکل بھول چکی تھی۔

پھر وہ سب مسوری گئے۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح خوب تفریح کی۔ راجپور سے مسوری تک خچروں پر جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ پی چو حسب معمول ہر اوکھے کا ضم کی طرح اس میں بھی پیش پیش تھے۔ خچروں کا انتظام کرواتے پھر رہے ہیں۔ نوکروں کو ڈانٹ رہے ہیں۔ اپنی بہنوں پر رعب جھاڑ رہے ہیں۔ ہر خچر کا سلسلہ نسب سر آغا خان کے گھوڑوں تک پہنچا دینے کے ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

لیکن کرسٹابل نے کہا۔ اس کی بچی کی طبیعت اچھی نہیں اور وہ ان سب کے ساتھ راجپور سے مسوری نہ جا سکے گی اور پی چو کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا۔

"ہٹاؤ نہیں جاتے خچروں پر۔ گولی مارو"۔ اس نے ہاتھ ڈھیلے ڈھالے چھوڑ کر کہا۔ رخشندہ یکلخت بیحد پریشان ہو گئی۔ یا اللہ۔ اللہ میاں۔ پی چو کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میرا بچارہ سوئیٹ پی چو۔

کرسٹابل کی بچی کو انفلوئینزا ہو گیا تھا۔ اس کی دوسرا تھ کے خیال سے رخشندہ بھی چند روز کے لئے راجپور میں ٹھہر گئی۔ باقی کے سب لوگ آگے چلے گئے۔

سلیم ایک روز شام بڑے زرینہ کو نئی دوائیں دینے کے لئے مسوری سے راجپور واپس آیا۔ لیکن کرسٹابل زرینہ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی کسی عزیزہ سے ملنے کہیں

اندر گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر ہوٹل کی لاؤنج میں رخشندہ کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ واپس جانے لگا۔

"رُوک ذرا اور ٹھہر جاؤ تو ہم تمہارے لیے چائے بنا دیں۔" رخشندہ نے اس سے کہا

"نہیں اب میں چل ہی دوں۔" اس نے کہا۔

"شیور؟ چاء کو جی تو نہیں چاہ رہا؟ بھئی میری بات مان لو۔ بادل گھر آئے ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی۔ ابھی کرسٹابل اور حفیظ بھی آجائیں گے۔ پھر ہم رات کے کھانے تک برج کھیلیں گے۔ اچھا چاکولیٹ پیئے گے؟" وہ ہمیشہ کی طرح ویسی ہی اخلاق کا مجسمہ مکمل میزبان تھی۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر موقع پر ایک سی۔ ہمیشہ وہی پوز کیے ہوئے اس نے سوچا۔ اگر وہ لاؤنج سے اٹھ کر باہر جانے کے بجائے کمرے میں گیا تو اسی طرح جیسے وہ کرن یا پی جو یا دل کے لئے چاء بناتی تھی۔ ان کی خاطر تواضع کرتی تھی۔ اس سے بھی ایسی ہی باتیں کرے گی۔ وہ بھی گویا ان ہی میں سے ایک تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ مہینوں سے، مدتوں سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ اس زیادتی کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ وہ ایک لحظے کے لئے یونہی کھڑا رہا۔ موقع کی حماقت انگیز حالت چھپانے کے لئے وہ جلدی سے سگریٹ لائیٹر ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ تینتیس سالہ سنجیدہ، مغرور انسان اس وقت اپنے آپ کو کس قدر احمق، بیوقوف محسوس کر رہا تھا۔

"اچھا بھئی تو پھر تمہاری مرضی۔ مت ٹھہرو۔ اس سردی میں مسوری واپس جاؤ گے آپ ہی کو زحمت ہوگا۔ پھر جناب آپ نہ کہیئے گا کہ ہم نے آپ کا انتظار نہیں کیا۔ ہم تو کل صبح ہی کولا گڈھ چلے جائیں گے۔" وہ اسی طرح منہ سے کھڑی روزمرہ کی باتیں

کہتی رہی۔" اچھا شب بخیر۔ مسوری میں سب کو ہم لوگوں کا لو دے دینا۔" اس نے لاؤنج کا دروازہ بند کر لیا اور گنگناتی ہوئی اندر چلی گئی۔

وہ برساتی میں آگیا اور جب اس کی کار سڑک کے موڑ پر سے گذر کر مسوری جانے والے نئے پل پر پہنچ گئی تب شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ واپس چلا جائے اور جزیرہ کیپری کے اس لاابالے سیلانی کی طرح جھک کر کہے۔ رخشندہ بیگم ——— میں ——— جو بہت مغرور تھا میں نے آخر کار اپنی ہار مان لی ———

اور جانے کس طرح ایسا ہوا کہ اسی وقت بارش کا ایک زوردار ریلا آگیا اور چند لمحوں بعد اس کی کار پھر ہوٹل کی برساتی میں کھڑی تھی۔ اس نے لاؤنج کے دریچے پر دستک دی۔ رخشندہ نے دروازہ کھولا۔ آتشدان کی روشنی میں اس کے سفید ہاؤس کوٹ کے گھیر کی سلوٹیں نارنجی نظر آرہی تھیں اور اس کے سیاہ، سیدھے ہیڈونا ایسے بال شانوں پر پڑے تھے۔ وہ شاید اسی وقت لباس تبدیل کر کے کمرے سے نکلی تھی۔

"ہلو ڈوک تم واپس آگئے ——— کیا موٹر خراب ہوگئی ؟"

"نہیں۔ میں چائے پینے آیا ہوں۔"

"ارے بھئی واہ ———" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کرن اور پیچی کے ساتھ رہ کر تم بھی بالکل خبطی ہوگئے ہو۔ دیکھو کرسٹابل اب تک نہیں آئی۔ اتنی سردی میں زرینہ کا نزلہ اور بڑھ جائے گا۔ اگر آج تم اسے دیکھ کر اس کی دوا تبدیل کر دیتے تو اچھا ہی تھا۔"

وہ اسی طرح گنگناتی ہوئی کمرے میں جا کر اسٹوو کے پاس چلی گئی۔

اوپر کی منزل میں ٹھہرا ہوا کوئی دل چلا انگریز کوئی پرانا ریکارڈ بار بار بجائے جا رہا تھا ——— بن جانسن کا وہ مشہور نغمہ "سیلیا سے" ——— جو وہ بیسیوں مرتبہ کالج میں

کرسمس ہوٹن فائر کے گرد گھومتے ہوئے اور کالج کے گلی کلب کی پارٹیوں میں خوب چلا چلا کر گا چکی تھی۔ میرے لئے پیالے میں صرف ایک پیار چھوڑ دو اور مجھے شراب کی ضرورت نہ رہے گی۔ روح کی گہرائیوں میں سے پیدا ہونے والی تشنگی جس کے لئے کسی آسمانی، الوہی مے کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر مجھے اس کے لئے مقدس خداؤں کا امرت بھی ملے تو میں اس پیالے کو اس سے تبدیل نہ کروں گا۔

باہر بارش آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔

وہ ریکارڈ بجا کیا۔ میں نے تمہیں گلاب کے شگوفوں کا ایک تاج بھیجا تھا۔ اس سے کچھ تمہاری عزت افزائی منظور نہ تھی بلکہ میں نے محض یہ سوچا تھا کہ تمہارے پاس یہ کبھی نہ مرجھائے گا۔ لیکن تم نے اس پر جھک کر چند سانس لئے اور واپس بھیج دیا۔ اور تب سے خدا کی قسم یہ اپنی خوشبو سے نہیں بلکہ تمہاری خوشبو سے اب تک مہک رہا ہے۔

ریکارڈ ختم ہو گیا اور کمرے کے فرش پر ادھر سے ادھر ناچتے ہوئے اور اس نغمے کے ساتھ اپنی آواز ملا کر گاتے گاتے وہ بھی دفعتہً خاموش ہو گئی اور اسٹوو کے پاس جا بیٹھی اور کیتلی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بھی خاموش تھا۔ وہ دونوں پھر ایک نئی جگہ پر تھے۔ خود کو ایک بار پھر بہت ہی تنہا پا رہے تھے۔ اس مارتی مرتی، لڑتی جھگڑتی، شور مچاتی دنیا میں تنہا۔ وہ ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کر رہے تھے۔ یہ کچھ کیا تھا —— محبت —— غلط۔ ہمدردی —— یہ بھی غلط۔ ذہنی رفاقت —— بالکل غلط۔ یہ نجانے کیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے سلیم چائے کی پیالی میں چمچہ بجانے لگا۔ ان کے قریب ہی اوٹن لکر کا تازہ پرچہ پڑا تھا۔

رخشندہ نے پانی کے اُبلنے کے انتظار میں وہ پرچہ اٹھا لیا اور اس کے ورق الٹنے لگی۔۔۔ راجکماری فلاں کا یہ پورٹریٹ جو مشہور یورپین آرٹسٹ مادام فلاں نے تیار کیا ہے۔ مسٹر فلاں اور بیگم فلاں جو یہ گرمیاں کشمیر میں گذار رہے ہیں۔ مس فلاں جنہوں نے راجکمار فلاں کے ساتھ اس چیتے کا شکار کیا۔ تاج اور ونگڈن کلب اور گلمرگ کی پارٹیوں کے گروپ ۔۔۔ حمق شکلوں کے فوجیوں اور ان کی چاند منگنی دلہنوں کی تصویریں۔۔۔ یہ بچارے لوگ۔۔۔ یہ بچاری دنیا۔۔۔ یہ بچاری زندگی ۔۔۔ وہ اداس ہو کر ورق الٹنے لگی۔

اس وقت سلیم نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اس لمحے میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میرے پیچھے کوئی ماضی نہیں ہے۔ صرف اس کا احساس ہے کہ وادیوں میں بہار کے پہلے سفید پھول کھل رہے ہیں اور بارش کی بوندیں اپنی جلترنگ منا رہی ہیں۔ آؤ ہم اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہیں تو یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہے۔ مجھے اس کے سب کچھ بھول جانے دو۔ بھول جانے دو کہ اس تھکے ہارے جیون میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی پشیمانیاں ہیں۔ جنم جنم کے کبھی نہ بہہ سکنے والے آنسو ہیں کہ ہم دنیا بھر میں گھومتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنا گھر کہیں نہیں ملتا کہ یہاں پر صرف جسم ہی جسم ہیں روح کہیں نہیں ملتی۔ لیکن تم مینڈونا کی طرح یونہی خاموش بیٹھی رہو تاکہ ہم تیزی سے نکلتے ہوئے وقت کی پرواز روک کر فضائے بیکراں کی وسعتوں کے اس گونجتے ہوئے سناٹے میں کھو جائیں اور پھر کچھ یاد نہ رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ رات بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ تم اس گیت سے جو ابھی اتنی

شگفتگی سے گارہی تھیں۔ بہت جلد اکتا جاؤ گی اور ایک اور دن طلوع ہوگا۔ طویل اور بے رنگ۔ اور اس کی چلچلاتی ہوئی روشن بدصورتی سے کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔ کہیں بھی نہیں۔

ارے ہائے شکر کہ کرسٹابل آگئی۔ اب بھائی جالینوس تم جلدی سے زرینہ کو دیکھ لو۔ تمہاری عمر عیار کی وہ زنبیل کہاں ہے؟" لاؤنج کا دروازہ کھلا اور دفعتاً زخشندہ کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ وہ جلدی سے اس کے ہینڈ بیگ کی تلاش میں لاؤنج میں چلی گئی۔

کرسٹابل اور حفیظ احمد خاں مع اپنی چار سالہ بچی زرینہ کے جسے انفلوئنزا ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

ارے مجھے اپنی خوشیوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دو اور رات بھر میں یہی سوچتی رہوں گی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ اسے وہ چھوٹا سا بھورا چوہا بھی بہت اچھا لگا جو چپکے سے کمرے کے ایک کونے میں سے نکلا اور دریچے میں جھلملتی ہوئی چاندنی کے راستے میں فرش پر اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا اور دوسرے لمحے پلیسٹری کا ایک ٹکڑا کتر کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ مدھم، بھیگی ہوئی، ٹھنڈی چاندنی اس کے چاروں طرف برستی رہی ہم سب آج کی رات کتنے خوش تھے۔ ہم لوگ اپنا مزیدار سفر ختم کر کے پھر اپنے پیارے شہر واپس آئے ہیں اور پھر تم چلے گئے (تم بے حد بور ہو) اور اپنے خوابوں کو ایک طرف سلا کر تم بھی سو گئیں لیکن جو باتیں ہم آج تک نہ کر سکے تھے۔ وہ اب چاند کے

سائے میں بنفشہ کے شگوفے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔ ہم اکیلے میں اپنے اس وجود سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں جو مجمع میں قہقہے لگاتا ہے ٹینس کھیلتا ہے۔ راجپور سے مسوری تک خچروں کی سواری کرتا ہے۔ انفلوئینزا کا علاج کرتا ہے۔ ارے تنہائی ــــ تنہائی ــــ شہد کے قطروں جیسا یہ تنہا لحظہ جوان کے درمیان لرز رہا تھا۔ اس لحظے کی خاموش لچک یکلخت ایک مہیب گونجتے ہوئے دھماکے سے ٹوٹ گئی۔

اس نے خوفزدہ ہوکر آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف تاریکی میں دیکھا دریچے کے باہر سرد چاند لڑکھڑا کر بادلوں کے پیچھے چھپ رہا تھا اور گہری کالی گھٹائیں غفران منزل کے پرانے اندھیرے باغ پر جھکی کھڑی تھیں۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آنکھوں کو خوب اچھی طرح ملا اور اندھیرے میں اسی طرح جلدی جلدی پلکیں جھپکاتی رہی۔

پھر یہ اندھیرا کم ہوا۔ آسمان پر پو پھٹنے لگی اور باہر بارش شروع ہو گئی (لکھنو میں برکھا کی مہاوٹیں جولائی ہی سے شروع ہو چکی تھیں اور جب وہ سب پہاڑ سے واپس آئے تھے تو انھوں نے اپنے شہر کو بہت ٹھنڈا اور نکھرا ہوا پایا تھا دن بھر ہوا میں باغ کے نئے پھلوں کی تروتازہ جھک منڈلاتی تھی اور گتّی ملہار گاتی تھی) پھر صبح ہوئی۔ گل شبّو نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آجاؤ گل شبّو۔ اس نے آواز دی اور لیمپ بجھا دیا۔ کیونکہ مدھم مدھم بارش کی پھواروں میں ملی جلی روشنی چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔

"ڈبیا چائے پیجئے گا؟" گل شبو نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کیوں ڈر رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اپنے گھر میں اپنی مسہری پر آرام سے سو رہی تھی۔ وہ راجپور اور مسوری میں بڑا دلچسپ سیزن گذار کر آ رہی تھی۔ ان کی پرانی پیاری خادمہ اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی۔ "بٹیا چائے پیجئے گا؟" "ہاں ۔۔۔" اس نے گل شبو کو جواب دیا۔

"بٹیا آپ کی ڈاک بھی ہے جو آپ کے پیچھے آتی رہی۔" گل شبو نے کہا۔

"وہ بھی لیتی آؤ۔" اس نے جواب دیا اور مسہری پر اوندھی لیٹ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں باغ کے درخت بارش کی پھواروں میں جھلے جا رہے تھے۔ صبح کی ہوا کا ایک بھیگا بھیگا جھونکا اندر آ کر اس کے بالوں کو پریشان کرنے لگا۔

گل شبو چائے کر اندر آگئی۔

"گل شبو ذرا کھڑکی بند کردو۔" اس نے کہا۔

"اچھا بٹیا۔" چائے کی کشتی اور ڈاک کا انبار میز پر رکھ کر وہ دریچہ بند کرنے کے بعد "ارے راما ساون بیتا جائے" الاپتی ہوئی باہر چلی گئی۔ سب ہی خوش تھے۔ یہ موسم کا اثر تھا۔ ساری دنیا بشاش تھی۔ اپنے کمرے کے دریچے سے باغ کے سبز نکھرے پتوں پر نظر ڈال کر اسے ہمیشہ یہی خیال آتا تھا کہ ساری دنیا بے حد خوش ہے۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے خطوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر ایک بڑے مستعد اور فرض شناس اڈیٹر کی طرح پہلے ان پلندوں اور لفافوں کو کھولنا شروع کیا جو نیویارک کے لئے آئے تھے۔

دفعتہً اس کی نظر اپنے نام ایک طویل سے لفافے پر پڑی جس کے اندر ایک طولانی دفتر تھا۔ اس میں مختلف طریقوں سے اسے دھمکیاں دی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض بڑی عجیب وغریب تھیں۔ اگر اس نے اپنی سیاسی جماعت سے قطع تعلق نہ کیا تو اس کا نتیجہ اس کے لئے بہت برا ہوگا۔ اس کی ساری نجی باتیں ڈاکٹر رلیم سے اس کی دوستی، اس کے اور اس کے ساتھیوں کے سارے حالات، اس کی تصویریں جو کہیں سے حاصل کرلی گئی ہیں۔ یہ سب چیزیں منظرِ عام پر لائی جائیں گی۔ نیوایر کے وہ سارے زہریلے مضامین لکھنے کی سزا اسے اس مناسب طریقے سے دی جائے گی کہ وہ بھی کیا یاد کرے گی۔ اس سے پورا خط ختم نہ ہو سکا۔ کیونکہ روتے روتے اس نے آنکھیں سُجالیں۔ دوپہر کی ڈاک سے اسے اسی طرح کے چند خط اور ملے۔ اس نے کمرہ اندر سے بند کرلیا اور وہیں مسہری پر اوندھی لیٹی رہی۔ اس کو پتہ نہ چلا کہ سارا دن گذر گیا اور اب شام ہو رہی ہے۔ اندھیرا پڑے وہ باغ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ چنانچہ یہ انجام ہے —— یہ انجام ہے —— وہ بار بار دل میں دہراتی رہی

چراغ جلنے کے وقت وہ آیا۔ اس کی رخصت ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنے ضلع کو واپس جانے والا تھا اور غفران منزل والوں کو خدا حافظ کہنے اور مسوری کی میزبانی شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ اس نے حسبِ عادت بی جو کے سٹنگ روم کا رُخ کیا اور اس نے دیکھا کہ سب کمرے خالی پڑے تھے۔ کنور صاحب اوپر کی منزل میں اور کنور رانی اندر رہی ہوں گی۔ بی جو اور پپو کلب گئے ہوئے تھے۔ عباسی خانم باہر آئیں۔ "بٹیا کہاں ہیں؟" اس نے ان سے پوچھا۔ "بٹیا؟ —— پتہ نہیں۔ ابھی تو یہیں تھیں۔ صبح سے تو وہ اپنے کمرے ہی میں —— ہیں۔ شاید ان کا جی ماندہ ہے۔"

عباسی خانم نے کہا۔

پھر بٹیا کی ڈھونڈیا مچی۔ وہ باغ کے اسی کونے میں اسی طرح بیٹھی ہوئی ملی۔ وہ شاید اس وقت تک روتی رہی تھی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسے بالکل نہ رونا چاہئے۔

وہ اس کے قریب آیا۔ "ارے بھئی کیا بات ہے خرشندہ بیگم؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" — وہ اس شخص، اس سلیم سے ہمدردی کی طالب نہ تھی۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی۔ "کچھ نہیں"۔ اس نے الٹے ہوئے گملے پر سے اٹھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "آؤ اندر چلیں۔ پی چو آتا ہی ہوگا تم یہ تاب گڈ ھ کل جا رہے ہو؟" — برساتی میں پہنچتے ہی انہیں پی چو مل گیا۔ وہ اسی وقت کلب سے آیا تھا اور خرشندہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا

پھر جب سلیم انہیں خدا حافظ کہہ کر اور اگلے اتوار کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور وہ دونوں سٹنگ روم میں اکیلے رہ گئے تو اس نے پی چو کو وہ سارے پلندے دکھائے۔

"فون — فون — فونہ" پی چو پیر پٹخ پٹخ کر بہت دیر تک سٹنگ روم اور برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "تم جانتی ہو روشی — ان خطوں میں چودھری شمیم کا ہاتھ ہے"۔

"اور سید اشتیاق —" خرشندہ نے پوچھا۔

"وہ چر کٹ چڑیمار؟ اس کی ابھی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی — لیکن کتنی ندامت ہے کہ ہمیں اپنی عزت کے لئے خاموش رہنا پڑے گا"۔

"ہائے اللہ —"

"لیکن روشی ہمیں نیوا یرا کی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی — میاں کی خاطر — اور — کرنا ہا راج کی خاطر"۔ اس نے چپ رہنے کے بعد کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو پی چو — نیوابرا کی پولیسی میں تبدیلی —؟" رخشندہ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔ باغ میں رات کی ہواؤں نے سنسنانا شروع کر دیا تھا۔

"تم کو نہیں معلوم — سیّد افتخار اور ان کی جماعت کا ریاست میں کتنا اثر ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ اثر روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں اس کا کوئی تدارک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں حقیقتوں کو دیکھنا پڑے گا۔ رعایا ہمارے خلاف بڑی آسانی سے مشتعل ہو سکتی ہے" — پی چو نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے کہا۔

"لیکن پی چو ایک بھیجڑ ریاست کی خاطر ہم اپنے اصولوں کو قربان کر دیں گے — تم کو کیا ہو رہا ہے؟ — تم پی چو تو ہو کہ نہیں آتے ہو کلب سے؟" اس کی آواز رُندھ گئی۔

"اصول — اصول — ان اصولوں کی وجہ سے میں تنگ آ چکا ہوں روشی — یہ نہ کرو اصول کے خلاف ہے۔ وہ نہ کرو روایات سے بغاوت ہے۔" پھر وہ جھلاتا چپ ہو گیا۔

"پی چو ہمارے سارے آئیڈیلز —" رخشندہ نے آہستہ سے کہا۔ پھر اسے بھی محسوس ہوا کہ اس نے کتنی بیکار بے معنی لغو بات کہی ہے۔

"جہنم میں بھیجو اپنے آئیڈیلز کو" پی چو کو کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ جنگلی بلے کی طرح غرّایا۔ "اب تک تمہارے رسالے کی اپیل بڑے اچھے بڑے اصول پرستانہ بڑے ایماندار پڑھنے والوں کے حلقے کے لئے تھی۔ لیکن وہ حلقہ اب قومی شعور حاصل کر رہا ہے اور اپنے اصول پرستی اور اپنے ضمیر کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نخاس میں پھینک چکا ہے اب قدیم کشتی ملنے والی ہے — لہٰذا تمہارے رسالے کو بھی

پینے پڑھنے والوں جیسا بننا پڑے گا۔ ورنہ اس کے لئے تیار ہو جاؤ کہ یہ ملت کے جان نثار تمہارے دفتر پر آکر دھاوا کر دیں۔ آج ہی میرے ایک سب انسپکٹر دوست نے بتایا ہے کہ ان کے سیاہ جھنڈوں والے روزان کا جلوس سب سے پہلے عفران منزل کا راستہ لے گا۔"

"پی چو یہ تو ہرگز نہیں ہو گا" رخشندہ نے دروازے کے پاس جا کر کہا۔ "تم برٹش گورنمنٹ کے بڑے نمک خوار اور فرض شناس ملازم ہو۔ یہ سب باتیں تم میرے لئے چھوڑ دو۔ کہ واہاراج یا عفران منزل پر اگر غنڈوں کا حملہ ہوا تو تم بڑے شوق سے اپنی ملٹری پولیس کے ذریعے اس کی حفاظت کروا لینا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چودھری شمیم جیسے لفنگوں سے تم ڈر جاؤ گے۔"

"تم اس کے لئے تیار رہو کہ —— وہی سب باتیں جن کی دھمکی ان خطوں میں دی گئی ہے۔ تصویریں —— اور —— اور ——" وہ ٹہلتے ٹہلتے دوسری طرف مڑ گیا۔ اس سے آگے وہ نہ کہہ سکا؛ ورسلیم کا نام اس کے حلق میں آکر اٹک گیا۔ اپنی بہن سے اسے یہ باتیں کرنا پڑ رہی تھیں۔ درختوں میں ہوائیں سنسناتی رہیں۔

او رد فعتہً رخشندہ کو محسوس ہوا کہ یہ سب کتنا بیکار ہے۔ اور اس کے سامنے پی چو اس کا بھائی کھڑا تھا اور ابھی جو کچھ وہ کہنے والا تھا۔ وہ اس کے ذہن میں کوند گیا اور عفران منزل غیر معمولی طور پر خاموش اور سنسان پڑی تھی۔

رات کا کھانا کھائے بغیر پی چو اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا اور اپنی مسہری پر آن گرا۔

ایک اور صبح ہوئی اور گل شبّو نے پی جو کے کمرے میں جا کر کہا "پی جو بھیا کرسٹابل بٹیا کا پھون آوا ہے" اور اس نے چلا کر کہا "میں کیا کروں فون آیا ہے تو چلی جاؤ میرے سامنے سے" وہ سہم کر باہر چلی گئی اور وہ وردی پہن کر شوں شوں کرتا پولس لائینز پریڈ لینے چلا گیا۔

پھر گل شبّو رخشندہ کے کمرے کی طرف آئی "بٹیا" اس نے آہستہ سے پکارا

"ہاں۔ کیا ہے گل شبّو" اندر سے بٹیا کی آواز آئی۔ اب تک وہ خوب گہری نیند سو رہی تھیں اور وہ جا مے کر تین دفعہ دروازے سے واپس جا چکی تھی۔ اُس نے سوچا۔ کل سے بٹیا اور بھیا کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ کہیں بٹیا بھی اسے نہ ڈانٹ دیں اس نے رسان سے کہا "ابھی کرسٹابل بٹیا پھون کئے رہن چھوٹے بھیا کو پوچھت رہن بھیا ہم پر بگڑے لاگے ۔۔"

وہ پوری طرح جاگ کر ایک طویل انگڑائی لینے کے بعد اٹھ بیٹھی۔ کرسٹابل نے سویرے سویرے غالباً کسی پکنک کا پروگرام بنانے کے لئے فون کیا ہو گا۔ کیونکہ موسم اتنا بہترین ہو رہا تھا اور پی جو اس سے بات کئے بغیر بگڑ کر چلا گیا۔ اس نے دریچے سے باہر پھر نظر ڈالی۔ موسم بہت ہی پیارا اور بھلا معلوم ہو رہا تھا اور بارش رات بھر برس کر کھلی تھی۔ ایسے میں بیٹھ کر میں چودھری شمیم کے خطوں کا سوگ مناؤں ہشت ۔۔۔ یعنی کہ ہُو ونشت ۔۔۔ ارے پی جو اتنے جلدی پریڈ پہ کیوں چلا گیا (یہ سب تو اتنی بیکار، بیحد حماقت زدہ باتیں ہیں) اور پھر گل شبّو نے آہستہ سے پکارا "ابھی کرسٹابل بٹیا پھون کئے رہن۔" وہ مسہری پر کاہل بلی کی طرح اوندھی لیٹی رہی اور ہوا میں اس کے بال اڑتے رہے۔ اس نے گل شبّو سے کھڑکی بند کرنے کے لئے نہیں کہا۔ اسے

اب یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ واقعی اللہ میاں۔ اب میں ان ساری باتوں کا کہاں تک سوگ کروں لیکن پی چو اتنے سویرے ہی پولس لائینز جا چکا تھا (کرسٹابل سے فون پہ بات کئے بغیر) ۔۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ ٹھیک ہے۔ بس یہی بات ہے ساری۔ دراصل۔ لیکن یہ غلط ہے۔ بالکل اصول کے خلاف بات ہے۔ (بہت ہی خوفناک قسم کا واقعہ ہے درحقیقت۔ وہ یکلخت اٹھ بیٹھی اور تکیوں کے سہارے ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکا کر غور کرنے لگی) گویا یہ بالکل صحیح ہے کہ پی چو، اس کا بھائی، اس کے علاوہ کسی اور ہستی کو بھی چاہ سکتا ہے۔ خواہ کرسٹابل حفیظ احمد جیسی دلکش ہستی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بچپن سے ان سب گدھوں سے چپکے چپکے اور نہایت شرارت کے ساتھ جلا کرتی تھی جو پی چو کو پسند کرتے تھے۔ پی چو کی محبت پر صرف اس کا حق تھا۔ صرف وہ ہی پی چو کی بہن تھی اور سب کمبخت کیوں اسے خواہ مخواہ چاہنا شروع کر دیتے تھے پی چو بے حد خوبصورت تھا اور یہ بڑی مصیبت تھی۔ سینٹ جوزفز کے وہ بڑے لڑکے اور اس کے اسکول اور کالج کی ساری لڑکیاں وائلڈ فلاور ہال اور زعفران منزل محض اسی لئے آتی تھیں۔ حالانکہ پی چو کو صرف اس کا ہونا چاہئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سے توام بچوں کی طرح زندگی گذاری تھی۔ انہوں نے آج تک سب کام اکٹھے کئے تھے۔ ساری باتیں اکٹھی سوچی تھیں۔ اپنا خوبصورت، کبھی واپس نہ آسکنے والا بچپن اکٹھا گذارا تھا۔ وہ نینی تال کی چاندنی راتوں میں لمبے لمبے پہاڑی راستے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے طے کرتے، ایک ساتھ نئی نئی شرارتوں کے پروگرام بناتے۔ وہ چڑیوں کے انڈے چراتی، جھیل میں اکیلی ناؤ کھینے کی کوشش کرتی۔ اسکول کا کام کبھی نہ کرتی۔ اور پھر بھی جانے کس طرح ہمیشہ فرسٹ آجاتی۔ پی چو کی چیزیں کھو دیتی

اور جو چیزیں کھولنے سے بچ رہتی تھیں۔ انہیں بڑی صفائی سے چرا لیتی۔ وہ اسے خوب ڈانٹتا۔ پولو ان دونوں سے بہت بڑا اور بہت سنجیدہ اور الگ تھلگ رہنے والا انسان تھا۔ صرف پی چو کے لئے وہ ایک مستقل قیامت تھی۔ وہ اسے ڈلنٹے ڈانٹتے اور لڑتے لڑتے تھک جاتا تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ اس سے پورے سات برس بڑا ہے۔ پورے سات برس۔ اسے اس کے سارے حکم ماننے چاہئیں پھر وہ گھنٹوں روتی اور اسے منانا پڑتا۔ وہ کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا کہ یہ شیطان کی اپنی نواسی چھوٹی غمرگوشنی کی طرح بگڑی رہے۔ پھر وہ نہایت رقت بھری آواز میں مظلومیت سے کہتی "پی چو چو کو بازر کھلاؤ گے"؟ جب وہ خوب لڑ بھڑ لیتے۔ تو وہ اپنا چوکولیٹ یا آئس کریم کا وعدہ پورا کرتا اور وہ دونوں خوش خوش کسی ریسٹوران یا میبٹرو پول میں جاتے۔ وہ بے حد لیڈی لائیک طریقے سے کرسی پر بیٹھ کر پی چو کے لئے چائے بناتی اور بڑے اخلاق اور تکلف سے پوچھتی "پی چو ڈارلنگ کتنی شکر"؟ اور بڑے اہتمام سے شکر گھول کر چمچہ طشتری میں رکھتی اور پتلی پتلی انگلیوں سے ایک انگلی بڑے آرٹسٹک انداز اور بڑی نزاکت سے اٹھا کر بالکل جس طرح میبٹرو پول کے ڈرائنگ روم میں بیگمات پیالی اپنے ہونٹوں تک لے جاتی تھیں۔ وہ چائے پیتی تھی اور پی چو میز کی سطح پر کوئی گت بجاتے ہوئے دریچوں کے شیشے سے باہر برستی ہوئی بارش کو بے دلی سے دیکھتا رہتا اور بارش کے قطرے جھیل کی سطح پر ان گنت چھوٹے چھوٹے بھنور بناتے رہتے۔ ان دونوں کی یہ دنیا بڑی مکمل تھی۔ لیکن پھر دفعتاً اس کے یہ کمبخت رقیب پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل رابیہ یار شادی شدہ عورتوں اور مردوں سے عشق لڑانا غالباً زیادہ دلچسپ اور زیادہ

فلیشن ایبل مشغلہ ہے۔ اس میں سُنا ہے کہ بہت "گلیمر" ہوتا ہے۔ کسی دوست نے پی جو سے ایک رات دلکشا کلب میں کہا تھا۔ ارے بھائی گولی مارو "گلیمر" کو یہاں پستی گم ہوئی جارہی ہے۔ پی جو نے سجیدہ اکتا کر اسے جواب دیا تھا)۔

اصول کے خلاف — بالکل اصول کے خلاف یہ شادی شدہ لڑکی سے عشق لڑانا — (وہ کنور عرفان علی خان کی بیٹی تھی) وہ کروٹ بدل کر پھر لیٹ گئی اور ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر پھر غور وخوض میں مصروف ہوگئی —

اور پھر اسے خیال آیا کہ اگست کی وہ تاریخ بالکل قریب آن پہنچی تھی۔ جب ملک بھر میں سید افتخار کے ساتھی سیاہ جھنڈے نکال کر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے والے تھے۔ ارے بھئی اللہ میاں — سوچتے سوچتے تھک کر وہ اٹھی اور گیلری میں جا کر اس نے کرن کو فون کیا۔ دوسرے سرے پر کرن بڑا خوش اور بشاش معلوم ہوتا تھا (غالباً یہ بھی اس پیارے سہانے موسم کا اثر تھا) اس نے سجید عاجز آ کر رنجیدہ آواز میں کرن سے کہا۔ "دیکھو تو کرن بھائی۔ پی جو کتنا جنگلی خرگوش ہوگیا ہے مسوری میں سارے وقت مجھ سے لڑتا رہا۔ میاں کے پاس اوپر نہیں جاتا ممی سے تو اس نے اس امیرپور ہاؤس کے قصے کی وجہ سے مدتوں سے لڑائی ٹھان رکھی ہے اور پھر ممی مجھ پر بگڑتی ہیں کہ میں اسے نہیں سمجھاتی اور پھر اگلے ہفتے وہ کالے جھنڈوں والی تاریخ آرہی ہے۔ جب قوم آ کر ہمارے گملے اور کھڑکیوں کے شیشے توڑے گی اور اخباروں میں اس کی خبریں چھپیں گی۔ یہ سب سنکر کرن کو اس کی اس بچوں کی سی شکایت پر ہنسی آ گئی۔

وہ بھی ہنس پڑی باہر بارش پھر شروع ہوگئی۔

بارش ہورہی ہے اور برآمدے میں پرانے پرانے ریکارڈ بج رہے ہیں اور اسوک کے درخت پانی کی پھواروں سے جھکے جا رہے ہیں۔ شہلا ڈارلنگ یوں نہیں۔ ایسے قدم رکھو۔ کوئیک کوئیک سلو سلو۔ کوئیک کوئیک (اور سب کمبختیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ناچے جا رہی ہیں اور باہر کی گیلی زمین میں سے کتنی سوندھی خوشبو نکل رہی ہے) پندرہ برس پہلے کے ایک نغمے کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ شہلا رحمٰن برآمدے کے فرش پر اپنے قدم رکھتی رہی۔ زینت آپا اسے سکھاتے سکھاتے تھک کر آرام کرسی پر جا بیٹھیں (یہ نور منزل ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ شہلا رحمٰن ہے جس کا اصلی نام صالحہ خاتون ہے۔ شہلا اس کا قلمی نام ہے۔ کتنی رومینٹک، گھنگھریالے بالوں والی لڑکی ہے۔ کتنا رومینٹک موسم ہے۔ شہلا انگریزی رقص سیکھ رہی ہے۔ ڈورو تھی سب پرانے پرانے ریکارڈ کومن روم میں سے اٹھا لائی ہے۔ کاش یہ کمبخت برکھا کا موسم کیلنڈر میں سے ہی نکل جاتا۔ یہ سب کمبختیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ناچے جا رہی ہیں۔ وائی ڈبلیو۔ سی۔ اے کی یہ اتنی بڑی کوٹھی جو نور منزل کہلاتی ہے۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے یہ ہرے لان، یہ اونچے اونچے بارش میں جھومتے ہوئے اسوک کے درخت، لان کے سرے پر پہرہ دیتا ہوا یہ اونچا، بھورا چرچ، یہ سب چیزیں پانی میں خاموشی سے بھیگتی جا رہی ہیں اور اتنی خاموشی طاری ہے۔ ہر چیز اتنی سنسان پڑی ہے۔ وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے میں رہنے والی یہ بیچاری اولڈ میڈز! اس لڑکی اس زخشندہ نے اتنے ترحم آمیز لہجے میں اپنی دوست گنی سے کہا تھا۔ ان میں سے کچھ برآمدے میں گراموفون کی موسیقی کے ساتھ رقص کرنے کی کوشش میں مصروف

ہیں اور باقی سب کومن روم میں شاید کیرم کھیل رہی ہیں اور امریکہ سے ہر مہینے آنے والے رسالے "مائی چرچ" کے پرچے دیکھ رہی ہیں)

• زینت آپا دوسرا ریکارڈ لگاؤں؟ شہلا اپنی پارٹنر کے ساتھ ناچتی ناچتی برآمدے کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔ زینت ریاض آرام کرسی پر لیٹی رہی (آج آج تو ہفتہ ہے۔ شام کو سیٹرڈے کلب کی میٹنگ کے لئے ہیں کون ساری بہنوں — انہوں نے سوچا) زینت ریاض اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے اس حلقے سے تعلق رکھتی تھیں جنہوں نے اپنے خیال میں سوسائٹی کے قوانین اور دنیا کے طے شدہ اصولوں اور اپنے خاندان کی روایتوں سے گویا بڑی زبردست بغاوت کی تھی۔ انہوں نے کالج کے زمانے میں بڑی بڑی اسکیمیں بنائی تھیں۔ یہ کریں گی وہ کریں گی اور بالآخر ایک معمولی سے گرلز کالج میں چار سو روپے ماہوار (معہ گرانی کے الاونس) پرنسپل ہوگئی تھیں اور باقی روپیہ گھر سے منگاتی تھیں اور وائی ڈبلیو۔ سی۔ اے میں رہتی تھیں اور عورت کی ذہنی اور معاشی اور سماجی آزادی کی سخت قائل تھیں (شہلا رحمٰن سیٹرڈے کلب کی نشستوں میں بحث کرتے ہوئے بڑے دلکش انداز سے ہاتھ ہلا کر کہنا شروع کرتی۔ دیکھئے نا۔ کتنی آپ لوگوں کی زیادتی ہے۔ کہ مرد تو جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی — لیکن بیچاری لڑکیاں — واقعی بیچاری لڑکیاں، سب ہمدردی سے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر مردوں کے بنائے ہوئے سماج کی زیادتیوں پر غور کرنے میں مصروف ہوجاتے) — زینت آپا کے خیال میں اس ذہنی آزادی کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ دنیا جہان کی ساری باتوں پر بالکل

بے لاگ اظہارِ خیال اور تبصرہ کیا جلئے۔ خدا کی اس خوبصورت، آزاد کھلی فضاؤں والی دنیا میں انسان نے اپنے آپ کو قدم قدم پر کتنا مقید کر رکھا ہے۔ لیکن اس بلند انٹلکچوئیل سطح پر پہنچ کر ہیبٹ کڈے کلب کی ان نشستوں میں ایک دوسرے سے یہ بحثیں کرتے ہوئے مخالف جنسوں کے ممبروں کو دفعتہً یہ پتہ چلتا کہ اسے یہ تو شدید قسم کے عشق کی ابتدا ہے اور کچھ عرصے تک وہ انٹلکچوئیل باتیں تکلفاً اور اخلاقاً گھسیٹی جاتیں اور پھر دنیائے آب و گل میں اترآنا پڑتا اور دونوں طرف سوچا جانے لگتا کہ اباّ میاں کو کس طرح اطلاع دلوائی جائے اور امی سن لیں گی تو کیسے ڈانٹیں گی اور نہ معلوم اس کی تنخواہ کتنی ہے یا یونہی انٹلکچوئیل بنتا ہے۔ زینت آپا کے دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ نور منزل میں مختلف دفتروں اور کالجوں میں کام کرنے والی جتنی لڑکیاں اور عورتیں رہتی تھیں۔ ان سب پر زینت آپا کا کافی رعب تھا۔ زینت آپا نے قسطوں پر ایک چھوٹی سی فورڈ خرید رکھی تھی۔ ان کا اپنا ٹیلی فون نمبر تھا۔ وہ لکھنؤ کی اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل رہتی تھیں۔ پچھلے دنوں سے انہوں نے لال باغ کے ایک مغربی موسیقی کے اسکول میں پیانو بھی سیکھنا شروع کر دیا تھا اور "ای فلیٹ میجر اور مائنر" کے سارے رموز جان گئی تھیں۔ دوستوں نے نو یہاں تک تجویز کیا تھا کہ اگلے الیکشن میں اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑی ہو جائیے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بہت ہی کامیاب اور قابلِ تقلید کریدو من تھیں اور آج صبح سے بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی اور شہلا رحمٰن کو جو ان کے کمرے کے برابر والے کمرے میں رہتی تھی۔ انہوں نے رقص سکھانے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی سائیکل یا رکشا پر اس وقت وہ کہیں نہ جا سکتی تھیں۔ حالانکہ موسم اتنا دلچسپ تھا موٹر کے کوپن صرف ڈاکٹر سکینہ کے

کے ذریعے بہت سے مل جاتے تھے اور ڈاکٹر سکسینہ آج کل اپنی ولایت پلٹ بیوی سے ملنے شملہ گئے ہوئے تھے) شہلا رحمٰن تو اتنی جلدی فوکس ٹروٹ والز سب سیکھ گئی کہ اس نے ایک کے بعد دوسرے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے اور دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجنے کے وقت تک برآمدے میں ڈوروتھی منوہر لال کے ساتھ ناچتی رہی۔ اتنی جلدی دن ڈھلنا شروع ہو گیا۔ ایک اور دن ختم ہوا۔ آج سیٹرڈے کلب کی نشست ہے اور کل اتوار ہے۔ ٹھنڈا، آرام دہ، مطمئن اتوار جب صبح صبح لان کے اس پار چرچ میں گھنٹے بجنے شروع ہو جائیں گے۔ کل دھوبی ڈے ہے۔ مراری کو دھونے کے لئے کپڑوں کی لادیاں دینے کے بعد یہ سب اپنی اپنی روحوں کی صفائی کے لئے چرچ جائیں گی۔ وہاں شاہ بلوط کی لکڑی کی قربان گاہ پر ریورنڈ چارلس فریزر کرم سنگھ وہی ساری باتیں اس اتوار کو دوبارہ دہرائیں گے جو خداوند ہمارے خدا کو پہلے ہی سے اچھی طرح معلوم رہی ہوں گی۔

"بارش ہو رہی ہے۔ سلیم اس اتوار کو پرتاب گڈھ سے نہ آسکے گا۔" کرن نے پورٹیکو میں بیٹھ کر آم کھاتے کھاتے آسمان کو دیکھ کر کہا۔ بارش ہو رہی ہے۔ ساون کے بادل بہت نیچے جھک آئے ہیں۔ زمین میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اڑ کر ہواؤں میں گھل مل رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ بارش کے قطرے بکھیرتے جا رہے ہیں۔ وہ قطرے گنی کے بالوں پر آپڑتے ہیں۔ رخشندہ کی ساری پر گر جاتے ہیں۔ برآمدے میں بوچھار کا پانی دیوار تک آ گیا ہے۔ گنی کے بال بھیگے جا رہے ہیں چلو کیچڑ میں چھپک چھیّا مچائیں۔ چلو باہر چل کر جامنیں گرائیں۔ آم کے باغوں پر کالی

گھٹائیں جھکی کھڑی ہیں سلیم نہیں آسکے گا۔ سلیم کہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوگا جس کی پھونس کی چھت پر مینہ برس رہا ہوگا جس کے چاروں طرف آم اور فالسے کے جھنڈ ہوں گے۔

بارش ٹھہر گئی۔ چلو کہیں باہر چلیں" گنتی چلائی۔ چلو کافی ہاؤس تک پیدل جائیں بڑا خوشگوار خیال تھا بھیگی ہوئی طویل، کالی، چمکدار خاموش سڑک بے حد اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس پر آرام سے بلیوں کی طرح لیٹ جائیے۔ یا اس کے کنارے ٹھنڈی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر قریب لگی ہوئی مہندی کی باڑ میں سے پتے توڑ توڑ کر پھینکتے رہئیے۔ وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے چھتریاں اور برساتیاں سنبھالیں اور درختوں کی ڈالیوں کو جو ہوا اور پانی کے بوجھ سے بہت نیچے جھک آئی تھیں اور جن میں سے بکلخت پانی کی بوندیں ٹپک پڑتی تھیں۔ اپنے سامنے سے ہٹاتی ہوئی وہ باغ کی روش پر آگئیں جب یہ بوندیں پتوں میں سے ایک دم سے برس پڑتی ہیں اور بھیگے ہوئے تر و تازہ پھلوں کی خوشبو ناک میں گھستی ہے تو بہت عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن کافی ہاؤس تو بہر حال جانا ہے۔ رخشندہ آگے آگے چلتی رہی۔ پورٹیکو کی سیڑھیوں پر کرن بیٹھا تھا۔ کرن ہم کافی ہاؤس جا رہے ہیں۔ جاؤ اس نے ویسے ہی بے تعلقی سے جواب دیا" کیا اینچیوں کی طرح مراقبے میں مصروف ہو۔ ہم حضرت گنج جا رہے ہیں۔ تمہیں وہاں سے کچھ چاہئے تو نہیں؟" "نہیں"۔ اس نے جواب دیا: "کرن کے لئے ٹافی لیتے آئیں گے" ڈائمنڈ نے فیصلہ کیا۔ وہ سب آگے چلی گئیں۔

۱

نہیں اسے تو کچھ نہیں چاہئے تھا" وہ غفران منزل کے پورٹیکو کی سیڑھیوں پر

بیٹھا تھا۔ بارش دوپہر بھر برس کر ٹھہر چکی تھی۔ اسے ٹافی، گنی، عالمگیر امن، انڈونیشیا کی آزادی کچھ نہیں چاہئے تھا۔ ہوا اس کی ناک میں گھس رہی تھی۔ اس میں باغ کے سارے پھولوں، پھلوں اور نئے ہرے پتوں کی خوشبوؤں کی لپٹیں امنڈ رہی تھیں۔ غفران منزل کے پچھلے حصے میں اودے، سُرخ اور سبز لہنگوں والی دھریاں اپنے بسنتی دوپٹے اڑاتی کڑے بجاتی ادھر سے اُدھر آجا رہی تھیں۔ گھاس میں سُرخ مخمل جیسی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ نہیں۔ اسے کرن بہادر کالجو کو کچھ نہیں چاہئے تھا۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا اور یہ بڑا اچھا لگ رہا تھا (ارے ہائے۔ یہ رنگ۔ تیز سبز گھاس۔ سرمئی بادل۔ سُرخ پھول، اُودی جامنیں)

وہ پھاٹک سے نکل کر ادرم روڈ پر آگئیں۔ گنی کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ڈائمنڈ نے اپنے بال اسکارف میں چھپا لئے تھے۔ رخشندہ نے غرارے کے پائنچے اٹھا لئے تھے۔ وہ سب بارش کے پانی میں سے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ گنی کے بال بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گنی بڑی پیاری لڑکی ہے۔ ڈائمنڈ اور بھی زیادہ پیاری ہے۔ میں تو خیر ہوں ہی بے انتہا سوئیٹ۔ کرن بھی سوئیٹ ہے پی چو بھی۔ دنیا بڑی اچھی جگہ ہے۔ رخشندہ نے طے کیا۔ "سلیم نہیں آسکے گا۔" ڈائمنڈ نے چلتے چلتے رک کر پانی سے بھرے ہوئے ایک چھوٹے سے گڑھے پر سے کودتے ہوئے کہا۔

"کیا بارش اب بھی ہو رہی ہے؟" پی چو نے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے لیٹے ایک آنکھ آدھی کھول کر پوچھا۔ "سلیم نہ آسکے گا۔"

"ہُم۔ بالکل نہ آسکے گا۔ پی چو آم کھاؤ گے؟" کرن نے وہیں سیڑھیوں پر

بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ وہ دراصل اس وقت اتنا سنجیدہ نظر آرہا تھا کہ کِرن کو خوف ہوا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔

"نہیں میں آم نہیں کھاؤں گا۔" پی چو نے برآمدے میں سے جواب دیا۔ "لڑکیاں ٹافی خرید کر ابھی واپس نہیں آئیں"؟ (تم اسے جو چاہو کہہ لو کِرن بھائی۔ یہ بہرحال تمہارا جرمن فلسفہ نہیں ہے۔ تمہارے حماقت زدہ سیاست اور آرٹ اور کلچر کے نظریئے نہیں ہیں) لڑکیاں ٹافی خرید کر ابھی نہیں لوٹیں"؟ اس نے پھر پوچھا

نہیں، اسے، کِران بہادر کا بچو کو کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بلّے کی طرح چڑھا بیٹھا رہا۔ ہوائیں درختوں کی ڈالیاں ہلیں اور بہت سی بوندیں گھاس پر گریں وہ تینوں واپس آگئیں کشمیر فروٹ مارٹ کے بہت سے کاغذ کے پیکٹ اٹھائے ومل ان کے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

"ہم ریڈیو اسٹیشن سے ومل کو بھی پکڑ لائے"۔ گتی نے بیحد شگفتگی سے کہا "کافی ہاؤس میں ہمیں شہلا رحمٰن اور زینت آپا ملی تھیں۔ ہم نے انہیں بھی بینگو پارٹی کے لئے مدعو کر لیا۔" ڈائمنڈ نے بہت خوش ہو کر اطلاع دی۔

"کافی ہاؤس میں گلیمر تو ائے بھی نظر آیا تھا۔ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا"۔ رخشندہ نے بتایا (وہی سہی)؟ پی چو نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے آدھی آنکھ کھول کر یاد دلانا چاہا)

"آج دن بھر کی خبریں کیا ہیں"؟ ومل نے سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سلیم اب تک پرتاب گڑھ سے نہیں آیا"۔ پی چو نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے مطلع کیا۔

"رعنا اور گیندا میں آج پھر لڑائی ہوئی۔" رخشندہ نے ٹافی کا ڈبہ کھولتے ہوئے وِل کو بتایا۔

"چلو انہیں دیکھ آئیں۔" ڈائمنڈ نے تجویز کیا۔

وہ سب پورٹیکو میں سے نکل کر باغ کی بھیگی ہوئی سڑک پر ٹہلتے ہوئے اصطبل کی طرف آ گئے۔

پولو کے سائیس رام بھروسے کی پہلی بیوی رعنا منہ پھیلائے ایک طرف کو بیٹھی جھما جھم برتن مانجھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے پشت کئے اس کی سوت گیندا ایک پیڑھی پر بیٹھی آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ سینئر اور جونیئر دونوں مہارانیوں کا ڈائیلوگ اپنی کلائمکس پر تھا۔ گیندا کو رام بھروسے چند ماہ پہلے باضابطہ گونا کرا کے گاؤں سے لایا تھا۔ لیکن رعنا کہتی تھی کہ صفا بھاگ کر آئی ہے چڑیل۔ رعنا بڑی طبع موزوں کی مالک تھی۔ اپنی سوت کے لئے اس نے ایک دوہا کہا تھا "گیندا مرے کوئی رو نبو ہی نہ۔ گیندا کا پھول کوئی چھو نبو ہی نہ" جسے سن کر رخشندہ بٹیا اتنا ہنسی تھیں۔ (بٹیا اور بھیّا لوگ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ دونوں ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں گیندا نے جلدی سے گھونگھٹ کھینچ لیا۔ رعنا غفران منزل کے اندر مہریوں میں کام کرتی تھی اور شعلہ پری، گل شبو، الماس اور زمرد کی صحبت میں رہ کر خاصی تعلیق ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے گھونگھٹ نہ کھینچا۔ بلکہ بڑے انداز سے اپنے گھنے، سیاہ بالوں کی لٹوں کو جو برتن مانجھنے میں چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ پیچھے سمیٹتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کرپی چھوٹے بھیّا کا زکام اب کیسا ہے اور بٹیا لوگ کیا آج پکوان نہ پکائیں گی۔ دیکھئے کیسی گھور کالی بدلی گھر آئی ہے۔

"ہاں۔ چلو پکوان پکائیں۔" ڈائمنڈ نے اور بھی زیادہ خوش ہو کر تجویز کیا۔ وہ اور گنی اور درخشندہ فوراً بڑی شگفتگی سے غفران منزل کے اندر چلی گئیں۔

بس یہ بات ہے ساری۔ یہی سارا قصّہ ہے دراصل۔" کرن نے دفعتہً محسوس کیا۔ لڑکیاں جہاں ہوتی ہیں۔ وہاں چاء ہوتی ہے۔ خلوص ہوتا ہے۔ گرمی، روشنی اور زندگی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ باورچی خانہ ہوتا ہے (روشی بی بی ذرا وہ گلری بک بھجوا دینا جو تم نے کل یونیورسل سے خریدی ہے۔ گنی کو چاہیئے۔ ایک روز جب اُس نے غفران منزل کے ٹیلی فون کا رسیور اٹھایا تو دوسرے سرے پر مسز شیو چرا کول کو کہتے سنا۔ بہ چاہے آئی۔سی۔ایس کی لونڈیاں ہوں۔ چاہے قوم کی لیڈری کرتی ہوں۔ پکوان ضرور پکائیں گی۔ یقیناً مسٹر کول کے ہاں کوئی بردکھوا ہونے والا ہے۔ اُس نے سوچا تھا)

وہ تینوں ٹہلتے ہوئے برآمدے کی طرف واپس چلے گئے۔ مینہ چھما چھم برسنا شروع ہو گیا۔

اوہ گوش۔ بارش اب تک کم نہیں ہوئی۔ پیاری ایمیلی نور منزل میں سینٹ جوزف کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے ہیں۔ پیاری ایمیلی ما شام کی چاء کے لئے کیک تیار کر رہی ہے۔ پیاری ایمیلی آؤ اپنی دعائیں کہیں سینٹ میری کی تقدیس اور فضل کی دعائیں (سینٹ میری جس نے کسی آدمی کو جانے بغیر ہمارے لارڈ کو جنم دیا۔ اور ہمارا لارڈ جس نے میرے اور تمہارے لئے کانٹوں کا تاج پہنا۔ چلو ایمیلی سسٹر اُس کا وقت بہت قریب آ گیا ہے) برآمدے کی لکڑی کی ہری جالی پر جو بیل

باہر سے جھانک آتی ہے اور اس کے سُرخ پھول بارش کی پھواروں میں جھومتے ہوئے اتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔ یہ موسم اتنا پیارا ہے۔ یہ دنیا اتنی اچھی ہے۔ لیکن جب مما اسٹوو پر آلو ابالتی ہے اور چائے کی کیتلی گنگنانے لگتی ہے تو کھانے کی میز پر آکر گریس کہنے کے بجائے تم چپکے سے کہتی ہو ڈیم اٹ آل —) خداوند ہمارے خدا کا نام پاک ہو جس نے آج کے دن ہمیں روٹی دی۔ ایملی سسٹر یہ تو میں ہوں تمہارا چھوٹا، پیارا بھائی جم۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ میں آج سنڈے اسکول نہیں جاؤں گا۔ میں کتھک ناچ نہیں ناچوں گا۔ یہ اتنی حماقت ہے۔ ایملی ڈارلنگ یہ تمہارا اتنا دیوانہ خیال تھا کہ میں ہندوستانی ناچ سیکھوں اور مرد ہو کر گھنگھرو پہنوں۔ ڈارلنگ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ یہ مجھے بالکل سوٹ نہیں کرتا۔ میں نیوی میں جاؤں گا۔ ڈارلنگ میں سیلر بنوں گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ساری دنیا گھماؤں گا۔ نیلے نیلے سمندر اور سفید برف کی چٹانیں اور — اور یہ سب کچھ۔ خداوند ہمارے خدا کی اتنی بڑی دنیا بہت خوبصورت! بہت اچھی ہے۔ تمہارے اس حماقت زدہ فیز سے آگے بھی ایک بہت وسیع کائنات ہے۔ اس میں بڑے اچھے اچھے انسان بستے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ میری پیاری سسٹر ایملی تم تو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے سو رہی ہو (جانے پانی کب رُکے گا)

ہاں۔ بارش ہو رہی ہے۔ وہ نہیں آسکے گا۔ وہ اپنی بڑی سی کوٹھی یا کسی خوبصورت ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوگا جس کے چاروں طرف آم کے جھنڈ ہوں گے۔ سینٹ جوزف کے گھنٹے بجے جا رہے ہیں اور اتنا اچھا موسم ہے۔ یہ آلو کی ترکاری ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ میرا چھوٹا پیارا بھائی جم ہے۔ ماسٹر جمیس مک گریگر۔ میرا اصلی نام ایملی مک گریگر تھا۔

کوئین آ روز میرا پروفیشنل نام ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں بہت تھک گئی ہوں۔
میں آج کہیں نہیں جاؤں گی۔ برآمدے کی سُرخ پھولوں والی بیل پانی میں اتنی خاموشی
سے بھیگتی جا رہی ہے۔ اتنی بارش میں وہ نہیں آئے گا۔

وہیں آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اسے نیند آگئی۔ کیونکہ اسے گھنٹوں کیبرے کی نئی
نئی قلابازیاں سیکھنی پڑتی تھیں اور پپا کا چقندر ایسا منہ بہت ہی سُرخ رہتا تھا۔ پہلے وہ
ریل کا انجن چلایا کرتا تھا۔ اب دن بھر صوفے پر پڑا اونگھتا تھا۔ جب وہ ای۔ آئی۔ آر
کے دفتر میں سو روپے پاتی تھی تو وہ سب نظر باغ میں صرف دو کمروں میں رہتے تھے
جس کے آگے ایک پتلا سا برآمدہ تھا اور اتوار کے روز وہ ای۔ آئی۔ آر انسٹیوٹ
ناچنے جاتی تھی۔ لیکن ٹرینوں میں لوگوں کی سیٹیں ریزرو کرانے کے کام سے وہ سخت
اکتا گئی اور جب سے پپا لوکوشیڈ چھوڑ کر آگئے تھے۔ اسے بھی جھاڑی پانی کے
اوک گروو اسکول سے (جو ریلوے والوں کے بچوں کے لئے مخصوص تھا) واپس آنا
پڑا تھا۔ پپا ہر وقت بہت زیادہ سُرخ رہتے تھے اور ممارات کو بہت دیر سے
گھر آتی تھی۔ لیکن جب مما کی ایک ٹانگ موٹی ہونی شروع ہو گئی تو اس نے رات کو باہر
جانا چھوڑ دیا اور پپا نے اسے ایک کمرشل اسکول میں ٹائپ سیکھنے کے لئے داخل
کر دیا۔ وہاں بہت اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں میں وہ سب کلاس کے بعد برآمدے
اور ٹیرس پر چلے جاتے تھے اور گراموفون بجایا کرتے تھے۔ لڑکے ٹافی اور چاکولیٹ
کے پیکیٹ لاتے تھے۔ اتوار کو وہ سب سینڈوچز اور چائے کے تھرموس اور
چلغوزے لے کر بنارسی باغ، دلکشا یا میلی گارد جاتے اور بے حد مزا آتا تھا۔
جب سڑکوں پر دونوں طرف پھول کھلے ہوتے تھے اور نیلے آسمان پر بادل چھا

جانتے تھے۔ وہ گھاس پر لیٹ کر اپنی بڑے بڑے پھولوں اور بڑے گھیر والی ٹوپی منہ پر ڈھانپ لیتی تھی اور اس کے تنکوں میں سے چھن کر جو ہوا اس کے چہرے کو لگتی تھی۔ وہ بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی (دل بیٹھ سا جاتا تھا اور یہ بہت اچھا لگتا تھا) پھر مے فیئر کے سندھی منیجر نے جس کی ہوائی جہاز ایسی اسٹوڈی بیکر ہے۔ اس سے کیبرے میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ اس نے ان سندھی لڑکیوں ملکی جاپانی سسٹرز کی بڈ ڈانس اکیڈمی میں ہندوستانی ناچ بھی سیکھ لیا۔ وہ سب نشاط باغ سے آبوی کورٹ میں آ گئے (خداوند ہمارے خدا کی یہ دنیا بہت خوبصورت بہت اچھی ہے۔ اس میں بڑے اچھے اچھے انسان بستے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ پانی میں بھیگتے ہوئے یہ خوبصورت پھول اتنے پیارے لگ رہے ہیں)

"ہاں یہ موسم اتنا پیارا ہے۔" اس نے آنکھ کھول کر جم سے کہا۔

مینہ چھما چھم برستا رہا۔

"ہاں۔ یہ بہرحال تمہارا جرمن فلسفہ نہیں ہے۔" پی چو نے کہا

کرن بلے کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ برآمدے میں لڑکیاں بنگو پارٹی کی تیاریوں میں مشغول تھیں (کلکتے کے قتلِ عام کے حالات دیکھنے کے لئے اپنے اخبار کی طرف سے اسے وہاں بھیجا جانے والا تھا اور اس کی روانگی سے پہلے ہی ان سب نے اس انوار کو اپنے سارے دوستوں کو بلا لیا تھا۔ روشی بی بی چائے کب ملے گی؟ باہر سے حفیظ احمد چلایا) وہ سب باہر گھاس پر چائے کی میزوں کے گرد جمع ہو گئے پی چو کاہلی سے ایک طرف کو آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

"بادش ٹھہر گئی ہے۔ سلیم آ گیا۔ سلیم یہ پلیٹ لے کر ادھر جاؤ۔ شہلا رحمن سے باتیں کرو۔ وہ بچاری ہماری پارٹیوں میں ہمیشہ نہایت شدت سے بور ہوا کرتی ہے۔"
وہ سب، ان کے سارے دوست میزوں کے قریب آ گئے (ارے یہ مرد۔ چاہے بنوانے کے لئے خود کو کتنا Helpless محسوس کرتے ہیں۔ کرسٹابل پیاری یہ سموسہ لو) ارے پی جو کو تو نیند آ رہی ہے۔ پی جو تم رات بہت دیر تک جاگے ہو۔ تم رات پھر ڈیڑھ بجے تک کلب میں رہے۔ "وہ ایک بج کر اکیس منٹ تک روشی"۔ اس نے ایک آنکھ آدھی کھول کر تصحیح کی (مرد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ ورنہ اس میں سب عورتوں والی عادتیں آ جاتی ہیں۔ وہ نہایت باقاعدگی سے کلب جانے لگتا ہے۔ دن بھر دوستوں میں بیٹھا رہتا ہے۔ رات کے بارہ بجے تک برج کھیلتا ہے۔ رخشندہ نے کہا۔
وہ سب اپنی اپنی پلیٹیں ہاتھ میں لئے گھاس پر ادھر ادھر گھومتے اور ہنستے رہے)
"ٹھیک ہے۔ محبت کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں ابدیت بھی ہو"۔ کرن نے بے حد اپنچیوں کی طرح سوچا۔ وہ سب، اس کی پیاری بہنیں رخشندہ، ڈائمنڈ اور کرسٹابل بڑی مصروفیت سے گھاس پر بیٹھی آئس کریم بنا رہی تھیں۔ باغ پہ بادل پھر گھر آئے۔

"ہاں۔ محبت کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں ابدیت بھی ہو۔ یہی بہت کافی ہے کہ مولسری کے پھول ہوا کے جھونکوں سے نیچے گر رہے ہیں اور ہمارے ساتھی ہمارے پاس موجود ہیں"۔ رخشندہ کچھ کلیاں اپنے بالوں میں ٹھونس کر آئس کریم کا سامان سنبھالنے میں مصروف ہو گئی۔

بارش شروع ہو گئی۔ "ارے بھئی سب لوگ اندر آ جاؤ"۔ گنی نے آواز دی

رخشندہ اس قدر تازہ اور بشاش اور صحت مند معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بالوں میں جلدی جلدی چند شگوفے پتوں سمیت ٹھونس لیے تھے اور ایک آم کھاتی جا رہی تھی سٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "کرِیا تم بھی میری طرح خوش کیوں نہیں ہوتے" "ان دنوں کچھ تازہ ترین اسکنڈلز کے امکانات معلوم نہیں ہوتے"۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر جیسے سونگھتے ہوئے کہا۔

"فوہ — جلیبی دائلڈ کیٹ"۔ سلیم نے چپکے سے کہا۔ زینت ریاض بالکل اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ فوراً ان سے فسادات کی تازہ ترین صورت حال پر گفتگو کرنے میں مشغول ہو گیا۔

"ول بھائی در اصل قصہ یہ ہے"۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی کہ "اسکنڈلز کا وجود بڑی طوالت ہے۔ لیکن اسکنڈلز کا فقدان اس سے بھی زیادہ بور کر دیتا ہے"

ول یہ سن کر بڑے عالمانہ انداز سے پلکیں جھپکاتا رہا۔

"سمجھے تم۔ تمہارے آرٹ اور کلچر کے حماقت زدہ نظریے"۔ پی جو چپکے سے غرّایا کرن بالکل چپکا بیٹھا رہا۔ "ارے پی جو۔ کرن۔ سلیم۔ سب لوگ جلدی سے یہاں آؤ۔ آسمان پر اتنی سویٹ دھنک نکلی ہے۔ اتنا اچھا لگ رہا ہے"۔ برآمدے میں سے ڈائمنڈ چلائی۔ سب پھر باہر چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا "تم لوگوں کے پاس کوئی باضابطہ فلسفہ حیات تو ہے ہی نہیں۔ بس جذبات۔ جذبات"۔ اس نے بہت ہی عالمانہ طریقے سے کہا۔

"یہ تو واقعی بڑی ٹریجڈی ہے"۔ حفیظ احمد بولا۔ "لو کرن بھائی۔ یہ آم کی آئس کریم کھاؤ۔ رخشندہ اور کرسٹابل نے بنائی ہے"۔

"نہیں میں آم کی آئس کریم نہیں کھاؤں گا۔ میں ٹافی بھی نہیں کھاؤں گا۔ جو گنتی لائی تھی۔ کوئی باضابطہ فلسفہ حیات نہیں۔ قطرہ" ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے سے مولسری کے بہت سے پھول ایک دم نیچے ٹھنڈی زمین پر ٹوٹ پڑے۔

وہ پھول رخشندہ نے اپنے بالوں میں لگا لئے۔ ہاں۔ یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے ساری محبت ہی ٹریجڈی ہے۔ محبت میں پائداری تو بہت ہی میٹر آف فیکٹ اور اَن رومینٹک چیز ہے۔ اس کی ساری ٹریجڈی، ساری خوبصورتی اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب اس میں ابدیت اور پائداری کا فقدان ہو (تمہارے لئے اور چار بناؤں کرسٹابل ڈارلنگ؟)

"یہ کاہے کا فلسفہ ہے رخشندہ بیگم؟" سلیم نے زینت ریاض سے باتیں کرتے کرتے اس کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"یہ ـــ یہ کنفیوژن ازم ہے۔" اس نے بڑی شگفتگی سے بتایا۔

"کنفیوشس ـــ ازم ـــ؟"

"ارے نہیں بھئی۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔" مولسری کے پھول چاروں طرف بکھر گئے۔

ہاں تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ارے نہیں وہ تو سبھی کچھ جانتا ہے۔ ارے وہ تو دیولوک سے آیا ہے (اتنا ونڈرفل۔ سوپر ڈیلشر اسمبشر۔ ڈائمنڈ نے کہا تھا) وہ کہے گا دن ہے تو وہ بھی اس کی رائے سے اتفاق کرے گی کہ دن ہے۔ اگر وہ کہے گا کہ رات ہے تو وہ بھی کہے گی کہ یقیناً رات ہے۔ ارے وہ تو اسے کوئی فلسفہ سمجھانے کی کوشش نہ کرے گی۔ بالکل چپکی بیٹھی رہے گی۔ اس کے لئے چائے بنائے گی۔ زندگی

نے ان سارے زلزلوں اور آندھیوں کو دبا اور روک کر اس قدر احتیاط اور اہتمام سے جو توازن قائم کیا گیا تھا۔ وہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ ارے اپنی اس اتنی پیاری دنیا کی ساری ترتیب اور تناسب کو اس نے آکر بالکل تہ و بالا کر دیا) اس نے ... نوں کے بھیگے ہوئے گچھے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"فیروز بھی آن پہنچا۔ سلیم جاؤ فیروز کو یہیں باغ میں بلا لاؤ" (اس نے پھولوں پر سے چہرہ اٹھا کر دوسرے لمحے پکارا) "فیروز؟ —" (یہاں سب کم بخت اس طرح باتیں کرتے ہیں۔ گویا طے شدہ بات ہے کہ سب ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ تعارف کی ضرورت ہی نہیں) "فیروز؟" — "ہاں"۔ اس نے کہا۔ "کیا وہ بھی بہت انٹلکچوئیل ہے" ؟ سلیم نے پوچھا "تم نے ہمارے یہاں کون سے خوفناک انٹلکچوئیل کو دیکھا ہے ؟ (نہیں۔ وہ انٹلکچوئیل نہیں ہے بچارہ۔ ابھی اس کی ناک طویل ہونی شروع نہیں ہوئی) اس نے کہا تھا۔ یہ چٹو پادھیا ہے۔ یہ کرن ہے۔ یہ حفیظ احمد ہے۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر چٹو پادھیا" ومل نے بڑی رحم طلب نگاہوں سے بہت بیکسی کے عالم میں اسے دیکھا تھا کہ رخشندہ بیگم میں چٹو پادھیا قطعی نہیں ہوں۔ پھر اس نے سمجھایا تھا۔ دیکھو بھئی سلیم ہم نے سب کے مناسب نام رکھ چھوڑے ہیں۔ تم جالینوس ہو۔ ڈون الورڈی گریٹ گلیمر بوائے ہے۔ یہ چٹو پادھیا ہے۔ یہ بجائے کیوں اس قدر قابل بے تحاشا عالم فاضل معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چٹو پادھیا سے بہتر کوئی نام ہو ہی نہیں سکتا۔ ومل کمار چٹو پادھیا۔ اور اسی وقت فیروز نے قریب آکر کہا۔ رخشی آج تم لوگوں کے پروگرام کی ریہرسل دیکھنے مسز پنڈت بھی آئیں گی۔ تو وہ جامنیں کھاتے کھاتے مڑ کر بولی: "واقعی؟ — کتنی کیوٹ بات ہے۔"

ایسے یہ دیوانگی، یہ دیوانگی۔ ہوا سے مولسری کی کلیاں برستی رہیں۔ بارش ٹھہر گئی۔ چلو سب لوگ باہر آجاؤ۔" ڈائمنڈ پھر چلائی۔

"رخشندہ بیگم آج تم بے حد خوش معلوم ہوتی ہو۔" اس نے پوچھا۔

"خوش؟ ارے بالکل نہیں۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کے سنجیدگی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ "ارے ملک میں اتنی تباہی مچ رہی ہے۔ ذرا سوچو تو۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ گویا اب وہ یونیورسٹی یونین میں اپنی کوئی تقریر شروع کرنے والی ہے۔ "دیکھو تو۔ کرن سویٹ کلکلتے جارہا ہے۔ ہم سب شام کو ریلیف فنڈ کے لئے پروگرام کی ریہرسل کرنے والے ہیں ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔ تم ہمارے ہاں کی آرٹ کی نمائش بھی دیکھنا۔ کل سیٹر ڈے کلب کا زینت آپا کے ہاں جلسہ تھا۔ تم اس میں گئے تھے۔ اس میں اتنے خوفناک سپر انٹلکچوئیل نظر آتے ہیں۔" "تم سیٹرڈے کلب کے جلسے میں کبھی نہیں گئیں؟" اس نے پوچھا۔ "نہیں مجھے یہ لمبی لمبی ناکوں والے سپر انٹلکچوئیل بالکل پسند نہیں۔ وہ سب ہمیشہ اپنے ہی متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ وہ صرف میرے متعلق باتیں کریں۔ آؤ باہر چلیں۔"

وہ سب باہر جاکر گھاس پر بیٹھ گئے۔ کرن ایک طرف کو اپنی مخصوص سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ پی چودھری کاہلی سے اپنی آرام کرسی پر لیٹے لیٹے زینت آپا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ سب ہمیشہ کی طرح خوب قہقہے لگا رہے تھے (پی چو ڈارلنگ یہ کچالو کھاؤ۔ جو لوگ کھانے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ بہت ہی سطحی ہوتے ہیں۔ رخشندہ نے اس سے کہا۔ وہ سب کھانے کی میزوں کی طرف چلے گئے۔ شام کا اندھیرا چھانا شروع ہو گیا

انہوں نے پورچ کا قمقمہ جلا دیا اور اس کی روشنی گھاس پر بہنے لگی۔ ہوا میں برساتی پھولوں اور نئے پتوں کی مہک تیز ہو گئی)

• یہ سب کھائے جائیں گے اور بحثیں کریں گے اور قہقہے لگائیں گے۔ ہمیشہ ان کے یہاں یہی ہوتا ہے۔ یہ روشنیاں آنکھوں میں گھسی جاتی ہیں۔ یہ لڑکے آنکھوں میں کھسے جاتے ہیں۔ یا اللہ، کہیں اندھیرا ہو۔ کہیں اندھیرا ہو۔ زور کی بارش آجائے اور یہ سب اٹھ کر یہاں سے چلے جائیں۔ واللہ یہ عجیب لوگ ہیں۔ دیوانے۔ فنوں کا سودائی۔ زینت ریاض تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھیں۔ عجیب لوگ ہیں بس گھوڑے۔ سیاسیات اور موسیقی۔ خواتین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سب یقیناً ہومو ہیں (اکثر جب وہ اتوار کے روز زعفران منزل آتیں۔ اور عباسی خانم یا لالہ اقبال نرائن سے معلوم ہوتا — کہ بھیا بیٹیا سب جنے گھوڑوں کے پاس ہیں تو وہ ٹہلتی ہوئی اصطبل کی طرف چلی جاتیں اور وہاں کسی جنگلے کی لکڑی پر جھک کر ان سب کی طرف دیکھنے لگتیں۔ گویا ان کے اس مشغلے میں بڑی ذہین قسم کی دلچسپی لے رہی ہیں۔ وہ اسی طرح اپنے کام میں مگن رہتے۔ یا انہیں دیکھ کر ٹوم ہوائیش انداز میں پکارتے بلو زینت آپا۔ ہم ستارۂ سحری کی تیمارداری کر رہے ہیں۔ آؤ ہماری مدد کرو۔ کسی کاہل کو شام کی چائے نہیں پلائی جائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ رخشندہ، گنی یا کرشابل اور ڈائمنڈ کو پکارتے تھے۔ ارے وہ تو گھڑی میں اور پی جو کہتا ہے۔ زینت آپا۔ آپ کو ہمارا یہ گھوڑا پسند آیا؟ ارے بھئی تم خود ہی پسند ہو۔ تمہارا گھوڑا تو الگ رہا اور پھر پی جو اپنی خالص اصطبلوں کی سیاست شروع کر دیتا۔ آپا اس گھوڑے کے لئے ہم نے بہت محنت اٹھائی۔ ستارۂ سحری کی ماں جو میاں نے روشی

کے لئے خریدی تھی۔ اسے چند سال ہوئے رانی کھیت میں لکڑ بگا اٹھا لے گیا تب سے ہم نے یہ کوشش کی کہ اس کی نسل کا گھوڑا ہمارے پاس سے نہ جانے پائے۔ پچھلے سال راجہ پرتاب گڈھ نے جو گھوڑے منگائے تھے۔ ان میں سے ایک —— ارے ہائے۔ ارے ہائے اللہ) ارے یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ یہ سب کہیں بکھر کر اپنے اپنے راستے کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہ سب کیوں اتنی باتیں کر رہے ہیں (اس وقت گھاس پر بیٹھے ہوئے وہ بڑے زور شور سے خرگوشوں اور سفید ولایتی چوہوں کے لئے مناسب ترین سائنٹیفک غذا پر بحث کر رہے تھے اور رخشندہ کو شابل سے پوچھ رہی تھی۔ تمہارے لئے اور کچا لو منگاؤں کرسٹی ڈارلنگ؟) ارے اندھیرا ہو جائے۔ بہت گھرا اندھیرا ہو جائے" زینت آپا۔ بھئی یہاں آئیے۔ آپ دنیا تیاگ کر اتنی دور کیوں جا بیٹھیں۔ حفیظ احمد نے پکارا پھر انہوں نے ایک اور بحث شروع کر دی (کنور صاحب نے رخشندہ کے نام سے برآری کوک کے بہت سے حصے خرید دیئے تھے اور وہ غالباً بڑے جوش و خروش اور انتہائی انسانی ہمدردی کے ساتھ اس طرح مزدوروں کا ذکر کر رہی تھی جیسے بہلکے یہ سارے ہزاروں لاکھوں کان کن صرف اسی کی ذمے داری ہیں۔ تمہارے یہ حماقت نو ٹریڈ یونین —— باغ کے اندھیرے میں سے اس کی آواز آئی) ہاں یہ سب کہیں بکھر کر اپنے اپنے راستے کیوں نہیں چلے جاتے۔ انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے رہنے میں کیا مزا آتا ہے۔ یہ سب یقیناً ہومو ہیں۔ زینت ریاض نے فیصلہ کیا کوئلے کے کان کنوں اور ٹریڈ یونین ازم سے چل کر ان سب کی گفتگو کا رخ کمیونزم اور سوشلزم اور مذہب پر پلٹ آیا گھٹی جو ہر سال ملی گنج کے میلے میں جاتی تھی اور اکثر

منگل کے روز مسز لیشو دھر اکول کے ساتھ امین آباد پارک والے مندر بھی ہو آتی تھی چپکی بیٹھی سب کی باتیں سنتی رہی اور پھر خصوصاً یہ ہمارے علماء کرام جواب مذہب کی موشگافیاں کرنے کے کرتے سائنس کی طرف توجہ فرما رہے ہیں"۔ سارنگ پور کا راجہ حفیظ احمد خان جو خیالات کے لحاظ سے بڑا ایکا سرخ بنتا تھا اور طالب علمی کے زمانے میں کرسٹابل سے شادی کرنے سے پہلے روس تک ہو آیا تھا، کہہ رہا تھا "ڈومینز کے انفلوئنزا سے اچھے ہونے کی خوشی میں اماں بیگم نے میلاد شریف کروایا۔ اس میں مجتہد العصر مولانا جھمن صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ اے مومنین بس کہ ثابت ہوا کہ یہ ہوائی جہاز کوئی نئی چیز نہیں۔ اے مسلمانو چشم بصیرت وا کرو کہ تخت سلیمان کیا شے تھی؟ — اللھم صلی علی — اور جناب رسالتماب جب شب معراج آسمان پہ تشریف لے گئے تو گویا یہ کیا تھا — ریڈیو کی لہریں —!! پڑھو درود پڑھو عاشقو درود پڑھو — درود سے کبھی غافل نہ ہو۔ درود پڑھو — (بھئی آپ لوگ بس مذہب پر ہی عنایت کیجئے۔ اس ترقی پسندی سے ہمیں معاف رکھئے) — اور اے مومنو صبح صبح باغ میں نکل جاؤ۔ کیا کیا پھول پتے رنگ برنگے کھلے ہیں کہ سبحان اللہ لازم آیا کہ ہم پوچھیں کہ یہ کس نے بنائے ہیں"۔ حفیظ نے ہنستے ہوئے حاضرین سے دریافت کیا "کسی کمیونسٹ نے بنائے ہوں گے"۔ پی جو نے جل کر کہا۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ کرن سیڑھیوں پر چپکا بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا (وہ اپنا ہر مضمون یا نظم شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر غیر ارادی طور سے "ادم" لکھ لیا کرتا تھا اور پھر مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے کاٹ دیتا تھا)

اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔ چلو بھئی سب لوگ ہمارے ساتھ ہماری ریہرسل دیکھنے

ڈائمنڈ نے کہا "ہم اتنا بہترین ورائٹی شو کرنے والے ہیں" - اس نے بڑی بشاشت سے سب کو اطلاع دی (یہ لڑکیاں اپنی پروپگنڈہ سکریٹری خود ہی ہیں - بڑی قابل لڑکیاں ہیں - گنتی جیمز جوائس پر مقالہ لکھ رہی ہے - رخشندہ امرناتھ جھا سے الجھتی ہے - مگر ان کی کلاسیکل موسیقی تم بالکل نہ سمجھ پاؤ گے سلیم بھائی - اہت اہنت بھید ناد کے پرتھم بھید - رخشندہ کہتی ہے یہ ایمن کلیان کا دلکش گیت ہے - دلکش گیت - سمجھے تم - اتنی سنسکرت مجھے نہیں آتی - حفیظا احمد نے کہا، پی چچا چلو ہمارے ساتھ - ڈائمنڈ نے اس کے پاس جا کر کہا - چلوں گا بھائی چلوں گا - اس نے بہت اکتاہٹ کے ساتھ آرام کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا -

وہ سب گھاس پر سے اٹھ کھڑے ہوئے -

اس وقت جانے کہاں سے رخشندہ کو بھولا بھٹکا ایک شعر یاد آگیا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مر گیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گذری

ارے کتنا غضب کا شعر ہے - بالوں میں سے مولسری کی کلیاں جھاڑتے ہوئے اس نے سوچا - غزالاں تم تو واقف ہو — ہائے ہائے اردو ادب اتنا سوئیٹ ہے - یقیناً اس وقت وہ اردو ادب کی عظمت پر ایک زوردار تقریر کر ڈالتی لیکن وہ سب ریہرسل میں چلنے کے لئے باغ کی سڑک پر آ گئے تھے - وہ چپ چاپ ان کے ساتھ ہولی -

"تمہارے اس پروگرام میں سب سے زیادہ خوبصورت اور اہم کون ہے" حفیظا حمد نے پوچھا - "میں ہوں" - اس نے آگے آگے چلتے ہوئے مڑ کر بے حد اعتماد اور شگفتگی

کے ساتھ کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی ڈارسے یہ ان لوگوں کی انانیت ہے کوئی باضابطہ فلسفۂ حیات نہیں ہے کرن نے سر ہلا کر سوچا اور سب کے ساتھ ساتھ چپکا چلتا رہا)

ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ سب آرٹ اسکول کے سایہ دار راستوں پر آگئے (چاند کے مقابل میں انہیں شانتی نکیتن کا اوشیر لہری نظر آیا۔ جو آہستہ آہستہ ندی کی سمت جا رہا تھا۔ غزالاں تم تو واقف ہو — اسوک کی قطار کے سائے میں شہلا رحمٰن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے دفعتہً پھر یاد آیا۔ بہت ہی نفیس شعر ہے) وہ سب باغ کی طرف اتر گئے۔ جہاں رات کی ہوائیں دھیرے دھیرے بہتی آرہی تھیں اور عمارت کے قمقمے جگمگا اٹھے تھے

یہ دنیا اتنی خوبصورت ہے۔ یہ موسم اتنا پیارا ہے یہ سب ایسے اچھے لوگ ہیں۔ شہلا رحمٰن ان سب کے ساتھ اسوک کی قطاروں کے درمیان چلتی رہی (آج کل وہ اتنی بہت سی باتوں سے، اتنے اچھے اچھے انسانوں سے محبت کر رہی تھی اور چونکہ اس کی محبت کا کسی نے اب تک جواب نہ دیا تھا۔ اس لئے اس کے سارے الوژن اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے ہاں یہ دنیا اتنی خوبصورت ہے زینت آپا) وہ سب ریہرسل کے ہال میں پہنچ گئے۔ لڑکیاں اسٹیج کے پیچھے چلی گئیں۔

وہ چپ چاپ کونے میں ایک صوفے پر بیٹھا اپنی لمبی، کالی پلکیں جھپکاتا یہ سب دیکھتا رہا۔ یہ راجپوتانہ کا جھمر ہے۔ یہ گجرات کا گربا ہے۔ یہ پورب کی کجری ہے۔ دیکھو کرن بھائی۔ اسٹیج پر سے اتر کر رخشندہ نے ان سب کو یہ ساری باتیں تفصیل سے بتائیں۔ مدراس کے سارے مشکل اسرار سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ سکھرا ہے۔ یہ اردھا

چند رہا ہے۔ یہ شولنگٹ ہے۔ ناتیہ، نرتنہ اور نرتیہ کے سلسلے اختلاف انہیں ذہن نشین کرائے۔ تم کہیں سمجھتے ہو؟ اس نے پوچھا۔ اور یہ دیکھو تم نے ہماری استاد ال کی گیلری کی تصویریں نہیں دیکھیں۔ یہ انند باگچی اور روی ورما اور ابنندرا ناتھ ٹیگور ہیں اور یہ ہمارا مانی شی ڈے اور ایل۔ ایم سین اور اودیا ما ہے (یہ ہندوستان ہے کرن بھائی۔ جہاں اودیا ما مر گیا اور کسی کو پتہ تک نہ چلا۔ کسی کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اتنا بے مثل ایسا زبردست فن کار ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ راجپوتانہ کی ایک گمنام ریاست میں جوان مر گیا۔ اس نے کہا) اور یہ نندلال بوس اور دستگیر اور ایشور داس ہے۔ سمجھے تم؟

"ارے میں تم کو نہیں سمجھ سکتا بھئی" سلیم نے اپنی کالی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں سمجھ سکتے؟ یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی پی جو ایک طرف کو پائپ ہونٹوں سے لٹکائے نسبتاً سنسان گیلریوں میں اکیلا اکیلا ٹہلتا رہا۔ کرن خرگوش کی طرح جا کر باغ میں ایک سرخ پتھر کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے کی ٹانگ پر بیٹھ گیا جس کے چاروں طرف اونچی برساتی گھاس اُگ آئی تھی۔ گنتی دس بارہ لڑکیوں کو ایک گربا کی مشق کرا رہی تھی۔ دفعتہً بالکل خاموش ہو گئی اور چپ چاپ اسٹیج کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گھنگھروؤں کو تال کے ساتھ بجاتی رہی (گنتی ڈارلنگ اتنی رنجیدہ، اتنی ہاسپیٹ منٹ ہود۔ نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں۔ رخشندہ نے اس سے کہا)

"ہاں میں کچھ نہیں سمجھ سکتا بھئی۔ (ہال میں بہت ساری لڑکیاں ایک

'فوک ڈانس' کی مشق کرتی رہیں، سلیم ٹہلتا ہوا برآمدے میں نکل آیا۔ گیلری کے سرے پر اسے زینت ریاض نظر آئیں (اس نے ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکا کر آنے والے خطرات کا اندازہ لگانا چاہا۔ لیکن گیلری بہت طویل تھی اور ہال کا دروازہ وہاں سے بہت دور تھا) "ہلو سلیم" ۔ انہوں نے قریب آ کر کہا "تم نے یہ تصویریں دیکھیں۔ ابنٹوردا اس کی تصویروں میں اس قسم کی یا سیت ہے جو صرف بنگال اسکول میں نظر آتی ہے" (یہ کمبخت ان کے سامنے کھڑا اتنی بے فکری سے اپنی سیاہ پلکیں جھپکا رہا تھا) یکلخت ہال میں سے سارے سازوں اور گھنگھروؤں کی آواز آنی شروع ہو گئی "زینت آپا چلئے ان لوگوں کا ناچ دیکھیں" شہلا رحمن ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اس کے سامنے سے نکل گئی اور اوشیر گیری کی تصویروں کے سامنے اس نے اپنے آپ کو تنہا موجود پایا۔ ارے تم کہاں ہو اوشیر بھائی۔ زندگی کو کھوجنے آج کی رات تم کدھر گئے ہو۔ زندگی زندگی۔ اس کے چاروں طرف اس کے بہت سے انسان بکھرے ہوئے تھے اور وہ زندگی کا ناچ اسے سمجھا رہی تھی۔ دیکھو یہ کھرا ہے۔ یہ اردھا چندرا ہے۔ یہ شوالنگ ہے۔

"یہ اتنی ساری ان گنت لڑکیاں جو ہر طرف گیلریوں میں تیرتی نظر آ رہی ہیں، انہیں آرٹ سے اتنی ہی شدید محبت ہے یا یہ ہمارے کنور صاحب کی وجہ سے یہاں آئی ہیں" ہال میں سے باہر آ کر فیروز نے اپنی روائتی بشاشت کے ساتھ کرن سے پوچھا۔

"فوں ـــــ پتہ نہیں" اسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو پاروتی کے اس ٹوٹے پھوٹے مندر میں بے خبر گوش کی طرح چڑھا بیٹھا ہے۔ اسے دنیا میں کچھ نہیں چاہئے

"ارے بھئی کنور صاحب بہادر۔" فیروز نے چلا کر پی چو کو پکارا۔ پی چو نے انگور کی قطاروں تلے ٹہلتے ٹہلتے اکتا کر مڑ کے اسے دیکھا۔ چلو بھئی ذرا ندی تک گھوم آئیں
بہت دیر سے بارش رکی ہوئی ہے اور ہوا بند ہے۔ فیروز نے اس سے کہا۔

"چلو۔ میں خود اتنا تھک گیا ہوں۔ روشی اور گیتی مجھے یہاں گھسیٹ لائیں مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے۔" پی چو ٹہلتے ٹہلتے بولا۔ "یہ سارا تمہارا آرٹ وارٹ جھمر جھمر۔" وہ رک گیا۔ "اسے تم جو چاہو کر ان بھائی۔ یہ تمہارے آرٹ اور کلچر کے حماقت زدہ نظریے نہیں ہیں۔ چلو ندی تک گھوم آئیں۔"

وہ تینوں اسوک کا سایہ دار تاریک راستہ طے کر کے ندی کی طرف چلے گئے
تب امیر پور راج کا انور اعظم درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا پاروتی کے اس ٹوٹے پھوٹے مجسمے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اندھیرے بادلوں میں سے جھانک کر چاند نیچے کی اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ درختوں کے پرے عمارت میں تیز روشنی ہو رہی تھی اور اس میں سے سازوں اور رات کی راگنیوں اور چاندی کے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چاند کے سامنے آ کر مجسمے کے ستون پر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف جھکے ہوئے برساتی پھولوں نے ایک دوسرے سے چلا کر کہا۔ اسے یہاں سے نکالو۔ گلاب کی جھاڑیوں نے غصے میں آ کر اپنے سرخ کانٹے کھڑے کر دیئے۔ یہ مولسری کے شگوفے آج ہماری پاروتی نے اپنے کالے بالوں میں سجائے ہیں۔ ارے تم انہیں کیسے چھو رہے ہو۔ بھائی گلیمر بولے یہ ہماری پاروتی نے اپنے کالے بالوں میں سجائے ہیں۔

ہماری پاروتی آج ان احمق گدھے دنیا والوں کو رقص حیات کی

ساری مداؤں کے اسرار سمجھانا چاہ رہی ہے۔ لیکن وہ کچھ سمجھ پانے کے بجائے بات پی رہے ہیں اور ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ آج ریہرسل دیکھنے مسز پنڈت آ رہی ہیں اور واقعی یہ کتنی کیوٹ بات ہے)

بارش بہت دیر سے ٹھہری ہوئی تھی اور ہوا بند تھی۔ تین لڑکیاں اسوک کے درختوں کی طرف سے دوڑتی ہوئی آئیں اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔ چاند کے مقابلے میں ان کے سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔ اس نے فوراً تعظیماً ان کے لئے جگہ چھوڑ دی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"ہم جنگل کے پریزادوں کو ڈھونڈنے آئے ہیں"۔ انہوں نے کہا۔

"جنگل کے پریزادوں کو ——؟"

"ہاں — جب راتیں گرم ہوتی ہیں اور چاند بھیگے ہوئے ارغوانی پھولوں پر جھک جاتا ہے۔ اس وقت ہم جنگل کے پریزادوں کی تلاش میں ہری وادیوں میں نکل آتے ہیں لیکن ہمیں جنگل کے سایوں میں اڑتے ہوئے وقت کے پروں تلے صرف پرانے گیت ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے ملتے ہیں اور جنگل کے پریزاد کہیں نہیں ملتے ہمیں اب آگے جانے دو ——" وہ تینوں اسی طرح دوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور ان کی نقرئی آوازیں بھیگتے سناٹے میں رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئیں (ازابلا تھوبرن کالج کی ان تینوں لڑکیوں نے اپنے اس مکالمے کی مشق جب اچھی طرح کر لی تو باغ کا راستہ طے کر کے وہ اسٹیج کے پچھلے دروازے سے ہال میں واپس چلی گئیں جہاں گرینڈ ریہرسل ہو رہا تھا اور مسز پنڈت کا انتظار کیا جا رہا تھا)

وہ پھر مجسمے کے ستون پر بیٹھ گیا۔

ہوا بالکل خاموش تھی اور پتے گہرے گہرے متوازن سانس لے رہے تھے۔
ایک اور سایہ درختوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ ___ ار ___ آپ ___ کون ہیں؟" اس نے سٹپٹا کر پوچھا اور پھر تعظیماً ستون کی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم مجھے نہیں جانتے؟" سائے نے گہری شیریں آواز میں پوچھا۔

"نہیں ___ کیا تم بھی جنگل کے پریزادوں کو ڈھونڈنے آئی ہو؟" (اسے اپنی اس بے تکلفی پر تعجب ہوا۔ لیکن صورت حال ہی اتنی بے ساختہ تھی)

"جنگل کے پریزاد؟ ___ بالکل نہیں۔ مجھے تم نہیں پہچانتے؟" اس نے آہستہ آہستہ پھر پوچھا۔

"تم ___ تم کوئی راجکماری تو نہیں ہو؟" اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ راجکماریاں اتنی بے تکلفی اور بے ساختگی سے باتیں نہیں کرتیں

"راجکماری؟" ___ سائے نے اس کا سوال دہرایا۔ "ہرگز نہیں۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ ___ میں زندگی ہوں۔" اس نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔

پتوں میں جنبش ہوئی اور ہوا دھیرے دھیرے ندی کے رخ بہنے لگی۔

"رات گرم ہے اور ہوا کے راگ بہت مدھم ہیں۔ آؤ ہم یہاں سے آگے چلیں۔" سائے نے کہا

چاند بادلوں میں سے نکل آیا اور اس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ کوئین روز تھی۔

"ہاں۔ آؤ۔ ہم یہاں سے آگے چلیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ سامنے

کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

رات گہری ——ہوتی گئی۔ ندی کی لہریں ساکت تھیں۔ درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا دھیرے دھیرے پچھم کے رخ بہہ رہی تھی —— (کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں۔ پتوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کی سنسناہٹ میں کوئی یہ کہتا سنائی دیا۔ ہوا بڑی کاہلی سے خوابیدہ درختوں میں سرسراتی رہی)

ان کی ریہرسل ختم ہوگئی۔ مسز پنڈت اپنی بیوک میں بیٹھ کر کاسلز روڈ واپس چلی گئیں۔ سب باہر نکل آئے۔ "کیوں اتنی رنجیدہ ہوتی ہو گئی ڈارلنگ" تھکی ہوئی رخشندہ نے اس سے کہا۔ "چلو اب گھر چلیں۔ راستے میں کسی جگہ رک کر کافی پئیں گے، کیسا خیال ہے؟" اس نے بڑی شگفتگی سے پوچھا۔ گنی طبلہ اور باجا ایک طرف کو لڑھکا کر اسٹیج کی سیڑھیوں پر سے اٹھ کھڑی ہوئی: "تم ٹھیک کہتی ہو روشی" اس نے کہا "نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں"۔

سویرا ہوتے ہی امبر پور ہاؤس کے سربراہ کار سید مرتضیٰ حسین پھر غفران منزل کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"بھیا ہم ابھی کوئی جواب نہ دیں گے۔ پی چو میاں نے کہلوا دیا ہے کہ ابھی ان کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے"۔ عباسی خانم نے پچھلے دالان میں آکر ان سے کہا۔ مرتضیٰ حسین بگڑ گئے۔ "واہ صاحب واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری بٹیا پگالی چڑھ چکی ہے۔ آج ایک برس ہونے کو آیا کہ آپ صاحبان ہی کے ایما سے تقریب کی گئی تھی۔ بی عباسی صاحب کنور رانی سے میری جانب سے عرض کر دیجئے کہ امبر پور آج

والوں کی آج تک ایسی توہین کیا نام کہ کبھی نہیں ہوئی (ہے ہے کیا غضب ہے قسم جناب عباسؑ کی میرا تو خون کھول رہا ہے)

عباسی خانم ان کا یہ پیغام لے جا کر اندر ہی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر پہلو بدلنے کے بعد سامنے سے گل شبّو کو آفتابہ لئے اندر جاتے دیکھ کر انہوں نے گلا صاف کر کے پھر پکارا "بی مہری صاحب ذری عباسی خانم سے کہئے۔ ہیں یہاں گھنٹوں سے بیٹھتا سوکھتا ہوں اور ان سے کہئے گا کہ انور میاں کے لئے کیا ارشاد ہے۔ بندہ آج آخری جواب لے کر یہاں سے ٹلے گا" گل شبّو بھی جا کر اندر ہی کی ہو رہی۔

تھوڑی دیر بعد شعلہ پری اور الماس آپس میں باتیں کرتی دالان میں سے گذریں "لگتا ہے بھیّا کی طرح بٹیا بھی ہاں نہ کر رہیں۔ میاں مرتضے حسین بے بس اب ستو کھا پیئے۔ کلائیڈ روڈ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ٹہلیے" شعلہ پری نے چپکے سے کہا (پر سبحانے بٹیا کو کیا ہو گیا ہے۔ ایکو آدمی ہی پسند نہیں آتا۔ نہ بٹیا کی سمجھ میں آتا ہے۔ نہ بھیّا کی۔ وہ اسی طرح سرگوشیاں کرتی ہوئی نہر کی طرف چلی گئیں)

کنور رانی اپنے کمرے میں بیٹھی لالہ اقبال نرائن سے امبرپور والوں کے خط کا جواب لکھوا رہی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت پی جو کو اندر بلوایا لیکن وہ پریڈ لینے کے لئے بہت سویرے ہی جا چکا تھا)

"ہُنہہ۔ نا بو جی کہیں کا" کچھ دیر بعد۔ جب سارے ملازمین اور لالہ اقبال نرائن کمرے سے چلے گئے تو انہوں نے گاؤ تکئے کے سہارے لیٹتے ہوئے اپنا خوبصورت سراپ۔ دلکش انداز میں ہلا کر غصے سے کہا "وہ کم بخت سارنگ پور والی قلماقنی" "کہاں قلماقنی جی؟" — وہ اسی وقت پیچھے سے چپکے سے آ کر ان کے پاس

تخت پر بیٹھ گیا۔ ممی تم ہم سے خفا ہو؟ ——اس نے پوچھا۔

"لے بس اب رہنے دو پی چو میاں۔ ماشاءاللہ سے یہ ہمارے سامنے——"
انہوں نے انتہائی رنجیدگی اور غصّے سے کہا۔

"لیکن ممی —— سُنئے تو——"

"کچھ نہیں۔ اب ہم آرام کریں گے۔ تم جا سکتے ہو۔" کنور رانی نے تخت پر سے
اٹھ کر پاندان بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ چپکا وہاں سے اُٹھ کر اپنے سٹنگ روم میں واپس آگیا اور ادھر سے
اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ رخشندہ بھی سویرے سویرے ہی اپنے
پروگرام کے انتظامات کے لئے سائیکل اٹھا کر نکل بھاگی تھی۔ وہ دونوں اب
بہت کم اکٹھے رہتے تھے۔ بہت کم شور مچاتے تھے اور اب وہ اپنے ریلیف فنڈ
کے قصوں میں جٹ گئی تھی۔ وہ اکیلا اکیلا ٹہلتا رہا۔

برساتی کی سیڑھیوں پہ زور سے ایک سائیکل گرانے کی آواز آئی "پی چو"۔
ڈائمنڈ نے باہر سے پکارا۔

"ہلو ڈائمنڈ"۔ اس نے دریچے میں جا کر جھانکا۔

وُہ تیر کی سی تیزی سے سٹنگ روم میں آگئی۔ پی چو مجھے ابھی ابھی یہ اسکرپٹ
ٹائپ کر کے کرائیسٹ چرچ لے جانا ہے۔ روشی دوپہر تک نہ آسکے گی۔ وہ جلدی
سے دفتر کے کمرے میں جا کر ٹائپ میں مصروف ہو گئی۔ پی چو خاموشی سے برآمدے
میں ٹہلتا رہا۔ ڈائمنڈ اپنے کام کے جوش میں اتنی مگن تھی کہ اس نے یہ نوٹس نہیں
کیا کہ وہ اتنا خاموش کیوں ہے۔

باغ کی سڑک پر سے کرن آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت تھکا ہوا، بہت رنجیدہ، بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اندر آ کر بھولے خرگوش کی طرح دیوان پر بیٹھ گیا۔ ڈائمنڈ نے اس خیال سے کہ متواتر کھٹ کھٹ کی آواز اسے پریشان نہ کرے ٹائپ رائٹر بند کر دیا (وہ سب کرن بہادر کا ٹچو، اس بے انتہا سویٹ اور گڈّو لڑکے کو اتنا چاہتے تھے) وہ کشنوں کے سہارے چپکا بیٹھا رہا، پھر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے "سکون ـــــ ارے تم سب مل کر کہیں سے مجھے تھوڑا سا سکون لا دو۔ کاہے کے لئے یہ ساری جد و جہد کر رہے ہو تم لوگ" ـــــ ریلیف فنڈ کے ڈرامے کے کاغذات ہوا میں ادھر اُدھر بکھر گئے۔ ڈائمنڈ نے جلدی جلدی جھک کر ان سب کو سمیٹ لیا "کرن بھیّا۔ یہ اسکرپٹ دیکھ لو میں نے ٹھیک ٹائپ کی ہے نا" اس نے شگفتگی سے پوچھا۔

"کرن چائے پیو گے؟" پی چو نے گیلری کے دروازے میں جا کر عباسی خانم کو آواز دی۔

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا" (اسے تو کچھ بھی نہیں چاہئے) وہ دفعتہً دیوان پر سے اُٹھا اور پھر باہر چلا گیا۔

باہر برسات کی دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہوا کی سنسناہٹ میں پیپل کے پتے تیر رہے تھے۔ اور کول تار کی سڑک بہت گرم۔ بہت سنسان۔ بہت طویل تھی۔

(کرن اکتا کر پھر اپنے نیشنل ہیرلڈ کے دفتر میں جا بیٹھا اور لیڈنگ آرٹیکل ٹائپ کرنے میں مشغول ہو گیا)

ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ساتھ ایسی دل ہلا دینے والی، اکتا دینے والی خبروں کا اضافہ ہوتا گیا۔ کلکتہ۔ نواکھالی۔ بہار۔ پنجاب۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اب دل و دماغ یہ سوچتے سوچتے بھی تھک گیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنے اپنے طریقے سے کام میں مصروف تھے۔ مختلف قسم کے امدادی فنڈز کا سیلاب آگیا۔ وہ سب پچھلے برسوں میں جنگ کے زخمیوں اور بنگال کے قحط زدہ انسانوں اور آئی۔ این۔ اے کے سپاہیوں کے لئے کام کرتے کرتے اکتا چکے تھے ان سب چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں اور اب ان کے سامنے پھر چاروں طرف سے روپے اور طبی امداد اور ان تھک محنت کا مطالبہ تھا کیونکہ انسانیت دم توڑ رہی تھی)

مارو گولی۔ یہ انسانیت کمبخت ہمیشہ سے دم توڑتی آئی ہے (نہ جانے ایسی حماقت زدہ، بالکل اکتا دینے والی نسل انسانی کو جاری رکھنے ہی کی کیا ضرورت ہے) رخشندہ نے سائیکل اٹھا کر کرائسٹ چرچ ہال کی طرف جاتے ہوئے سوچا (لیکن میں گویا CYNIC بنتی جا رہی ہوں اور یہ بڑی ٹریجڈی ہے) اسے راستے میں ریڈیو اسٹیشن سے ڈرامے کا اسکرپٹ لینا تھا۔ لیکن وکّل اسے عفران منزل کے پھاٹک ہی پر مل گیا۔ وہ بے حد اکسائیٹڈ معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جلدی سے سائیکل پر سے اتر آیا۔

"تم نے ایک خبر سنی رخشی" اس نے جلدی جلدی اپنی پیشانی پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کہیں اور پانچ چھ ہزار جانداروں نے ایک دوسرے کو مار ڈالا" رخشندہ نے

بے فکری سے پوچھا۔ وہ دونوں مٹرک پر آ گئے

"نہیں۔ لیکن تم یقین ہی نہیں کرو گی۔" وِل نے منہ لٹکا کر کہا۔

"مجھے تو وِل بھائی ہر بات کا یقین آ جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بالکل ناقابل یقین ہو"
اس نے بے پروائی سے سر ہلا کر کہا اور پھر ہنسنے لگی۔ اس کے بال ہوا میں اڑتے جا رہے تھے۔

"چنڈو خانے کی تازہ ترین اطلاع ہے کہ وہ تازہ وارد ڈوان ژوان کا بھتیجا صاحبزادہ سعید احمد خان ہماری گنتی پر بالکل یعنی کہ جان دے رہا ہے تقریباً قریب۔" وِل نے جلدی جلدی کہا۔ گویا ریڈیو پر موسم کی رپورٹ سُنا رہا ہے۔

وہ ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکاتی رہی۔ پھر اس نے سائیکل سنبھال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "سو وٹ؟"

"ایں؟" — وِل نے بھی ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکائیں۔ "ارے روشی۔ یعنی کہ تمہیں شوک نہیں پہنچا — سوچو تو کہ گنتی — یعنی کہ گنتی کول —"

"تو؟ — (بچارا ہمارا سوئیٹ گڈو کرن بہادر کا گجو؟) ہٹاؤ اس قصے کو وِل بھائی۔ ارے تم جانتے ہی نہیں میں تو CYNIC ہوں) ہاں ہٹاؤ اس قصے کو گولی مارو۔"

"ایں؟"

"ارے تم تو سویرے سویرے اتنا بور کر رہے ہو۔ کہہ تو رہی ہوں بھائی۔ گولی مارو سب کو۔ تم نے اسکرپٹ رنجنا کو دے دیا؟"

وِل پلکیں جھپکاتا رہ گیا۔ وہ دونوں اوڑم روڈ پر سے نکل کر کرائسٹ چرچ

ہال کی طرف مڑ گئے۔

برسات کی دھوپ تیز ہو گئی (واللہ عجیب دیوانی لڑکی ہے روشی۔ وِل کمار چٹوپادھیا نے اس کے ساتھ ساتھ گرم اور سنسان سڑک پر سائیکل چلاتے ہوئے سوچا)

ہاں۔ یہ دنیا عموماً اس قدر عقلمند، اتنی سنجیدہ، ایسی اکتا دینے والی تھی۔ اس دنیا کی اسٹاک ایکسچینج کی "چھوڑ دو۔ پکڑ لو" میں مصروف لوگ اور یہ چھوٹے چھوٹے انسان جو اپنے محبت اور زندگی اور آرٹ کے آئیڈیلز کو بے حد جلی حروف میں لکھتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں اس قدر حماقت زدہ تھیں کہ ان ساری باتوں میں توازن قائم رکھنے کے لئے تھوڑی سی دیوانگی بے حد ضروری تھی (اسے ان سب باتوں میں، دوسروں کے اسکنڈلز پر تبصرہ کرنے میں، کیونکہ اپنے متعلق اسکنڈلوں میں کوئی نوولٹی نہیں ہوتی تھی۔ دوسروں کو شوک پہنچانے میں، بے حد مزا آتا تھا۔ ان چیزوں سے زندگی بڑی خوشگوار اور زندہ رہنے کے قابل بن جاتی تھی) اسے اس دنیا میں بہت سی چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ سفید ولائتی چوہے، بدصورت لڑکیاں، بہت پرانے فلموں کے گیت، پہاڑی سانیال کا "ورشن ہو کے تیہارے ساجن" اور "دل جنگل بیچ میں بہلتا ہے"۔ تازہ شکار کی ہوئی مرغابیوں کے گرم پَر، کوکل کی نظم "ماں یہ میرا پھول جیبن ہے"۔ گھوڑوں کے زنجبن شاندار، گرم جسم، وہ کرائسٹ چرچ ہال سے واپس آ کر کاہل بلی کی طرح بہت دیر تک سوتے رہنے کے بعد اٹھی اور اس کا جی چاہا کہ خاموش سڑکوں پر ٹہلتی پھرے۔ اس نے ڈائمنڈ کو آواز دی) ڈائمنڈ ڈارلنگ چلو دھوپ میں گھومیں۔" اس نے کہا۔

وہ تینوں ٹھنڈے، اندھیرے کمرے میں سے نکل کر باغ میں چلی گئیں (ہائے ہائے یہ رنگ۔ تیز سبز گھاس، نیلا آسمان، سرخ پھول۔ اودی جامنیں) پھاٹک کے باہر سڑک پر املی کے نیچے ایک سبزی فروش اپنا ٹھیلہ لئے کھڑا سستا رہا تھا۔ ہائے کتنی پیاری پیاری سبزیاں۔ ڈائمنڈ چلائی۔ تیز دھوپ میں اڑتی ہوئی ویران گرد کے مقابلے میں سبزیوں کا یہ انبار آنکھوں کو بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ ٹھیلے کے قریب جا کر اس نے ان سب کو چھوا۔ سرخ، نرم ٹماٹر، پالک اور مولی کے ڈھیر ہری ہری خوبصورت مرچیں۔ ٹھنڈی ککڑیاں۔ ان سب پر ٹھیلے والے نے پانی چھڑک رکھا تھا۔ وہ حیرت سے ان سب کو دیکھتا رہا۔ کچھ چاہئے بٹیا؟ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ہاں ہمیں یہ سب چاہئیں۔ اس نے کہا (ان سبزیوں سے زیادہ خوبصورت، پیاری، آرام دہ چیز دنیا میں کوئی نہ تھی) اچھا بٹیا میں ٹھیلہ کوٹھی پر لئے جاتا ہوں۔ وہ ٹھیلہ آگے بڑھا لے گیا۔ وہ سنسان سڑک پر بڑی بےفکری سے چلتی رہیں۔ گویا چاندنی رات تھی۔ سڑک کے موڑ پر اپنی لکڑی کی ہری گمٹی میں پانوں کی پیتل کی بالٹی کے پاس بلدیوا اکڑوں بیٹھا زور زور سے بڑی یکساں آواز میں رامائن پڑھ رہا تھا۔ کاش اس گمٹی تک جا کر پان خرید سکتے۔ گنی نے کہا۔ کاش اکیلے پر بیٹھ کر بنارسی باغ کے چاٹ ہاؤس تک جا سکتے۔ ڈائمنڈ نے تمنا ظاہر کی۔ (افسوس کہ وہ اکیلے تک پر نہیں بیٹھ سکتی، رخشندہ نے سوچا) چلو دریا پر چلیں۔ گنی نے تجویز کیا (ناؤ کے سرے پر پانی میں پیر ڈالے بیٹھے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس سے دل ڈوب سا جاتا ہے۔ پانی کی لہریں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں) نہیں بھائی۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ صرف امرودوں کے باغ تک جا کر لوٹ

آئیں گے)

دھوپ میں سڑک کا ایک چکر لگا کر وہ واپس آ گئیں۔

ٹھنڈے اندھیرے کمرے میں مسہری پر گر کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں
"ہاں، زندگی اتنی دیوانی، اتنی دلچسپ ہے کہ پینتیس سال کی عمر کے بعد تو میں خودکشی کر لوں
گی" اس نے جمائی لے کر اطمینان سے طے کیا۔

گنی اور ڈائمنڈ قالین ایک طرف ہٹا کر کمرے کے ٹھنڈے فرش پر جمپر کی مشق
کرنے لگیں (ایسی اچھی، ٹھنڈی، آرام دہ دنیا میں انہیں ان مارتے مرتے جانداروں
کی وجہ سے جو انسان کہلاتے ہیں۔ دوپہر کو سونے کے بجائے گھنگھروؤں کے
بوجھ سے تھکنا پڑ رہا تھا)

باہر نیلے روشن آسمان کے نیچے فضا میں تیز رفتار بگلے چکر کاٹتے رہے
(پہلا کانٹ سمایت بھیا ۔۔۔ سڑک کے موڑ پر اپنی ہرے رنگ کی گمٹی
میں بیٹھے بیٹھے بلدیوا نے اپنی یکساں آواز میں آخری سطر تک پہنچ کر زور سے
رامائن بند کی اور ریان کے سرخ کپڑے پر تازہ پانی چھڑکنے میں مصروف ہو گیا)